شاہکار

افرو ایشیائی

ادب

نمبر

مجلس مشاورت

- سید احتشام حسین
- خواجہ احمد عباس
- مہندر ناتھ
- خلیل الرحمٰن اعظمی
- مظفر شاہجہانپوری
- جیلانی بانو

قیمت ۲/۲۵

ایڈیٹر

محمود احمد ہنر

دفتر شاہکار، ۱۳۴ بخشی بازار، الٰہ آباد-۳

فہرست

افسانے

مضامین

نظمیں

سید احتشام حسین

پیش لفظ

ایشیا اور افریقہ رنگا رنگ تہذیبوں، قوموں، زبانوں، سیاسی اور مذہبی عقیدوں پر مشتمل ملکوں کا مجموعہ ہیں۔ ان میں سے بعض کی تہذیبیں اتنی پرانی ہیں کہ تاریخ کی عینک سے بھی دھندلی اور معدوم نظر آتی ہیں۔ بعض کو بہت بعد میں اپنی شخصیت پہچاننے کا موقع ملا ہے، بعض آج ترقی یافتہ یورپ اور امریکہ سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں اور بعض اتنے پچھڑے ہوئے ہیں کہ وہ دورِ جدید کی مادّی برکتوں سے محروم ہیں۔ بعض کے ادبی اور فنی نقوش ہزارہا سال پیچھے تک کی راہ روشن کرتے ہیں اور بعض نے موجودہ دور ہی میں علم و فن کی روشنی دیکھی ہے، ان ملکوں میں سے اکثر بڑی جدوجہد کے بعد بیرونی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، بعض اب بھی غلام ہیں اور زنجیریں توڑنے میں مصروف۔ ان ملکوں میں چین اور جاپان، سوویت ایشیا اور ہندوستان، ایران اور عرب، مصر اور مراکش، انڈونیشیا اور ویت نام، پاکستان اور نیپال، فلسطین اور سیریا جیسے اہم علاقے ہیں جن کی تاریخ شعلہ و گل، سیف و قلم، محبت کے گیتوں اور جنگی ترانوں سے بھری ہوئی ہے، جو کبھی فاتح مفتوح کی حیثیت سے ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں کبھی عقائد کے اشتراک کے ذریعہ، کبھی تہذیبی قدریں انھیں ملاتی رہی ہیں کبھی تجارتی لین دین نے تعلقات استوار کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہزارہا سال میں ایک موقع پھر آیا ہے کہ ایشیا اور افریقہ ایک تاریخ ساز عہد میں داخل ہو کر اپنی تقدیر آپ بنانے کے آرزومند ہیں۔ اُن کا آج کا ادب اسی سوز و ساز آرزو کا آئینہ دار ہے۔

اب اس حقیقت کے اظہار میں کوئی ندرت نہیں رہ گئی ہے کہ ادب ہی قومی زندگی کے خوابوں، ارمانوں اور امیدوں کا سب سے واضح ترجمان ہوتا ہے۔ تاریخ جن حقائق کے اظہار سے قاصر رہتی ہے، شعر و ادب انھیں کہانیوں، گیتوں اور داستانوں کے روپ میں پیش کر دیتے ہیں۔ کسی ملک کا ادب اس کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ یہ محض شاعری نہیں ہے کہ شاعر کو "دیدۂ بینائے قوم" کہا گیا ہے یا اُسے پیمبری کے کام میں شریک بتایا گیا ہے۔ درحقیقت اس کا شعور قومی اور انسانی مزاج کی نہیں کھولتا اور دلوں کے داغ نمایاں کر دیتا ہے، وہ زخم پر مرہم رکھتا اور جمود میں طوفان پیدا کرتا ہے اسی لئے ادب میں تنوّع کے ساتھ ساتھ قومی مزاج کی یکرنگی بھی پائی جاتی ہے۔ افریقہ اور ایشیا کے ادیب آج آزادی، امن، انصاف اور ترقی کے جذبات سے بھرے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے لئے بھی زندگی اور سکون آمیز ارتقا چاہتے ہیں اور دنیا کے تمام انسانوں کے لئے بھی۔ اس کے اظہار میں نرمی اور گرمی، دردمندی اور طنز، جذباتی رنگ آمیزی اور استدلالی کھرداپن، شعریت اور نثری سادگی سبھی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ ادب کبھی قید خانوں میں تخلیق ہوا ہے، کبھی جنگ کے میدانوں میں، کبھی گوریلا پناہ گاہوں میں اور کبھی حصولِ آزادی کے بعد فخریہ لمحات میں۔ غرض کہ یہ براہ راست دلوں کی دھڑکنیں ہیں جو فنی آراستگی سے پیش کر دی گئی ہیں۔

شاہکار کے اس افرو ایشیائی ادب نمبر میں چند کہانیاں اور چند نظمیں شامل ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی انفرادیت اور واقعیت کی وجہ سے نمایاں ادبی حیثیت کا اظہار کرتی ہے۔ ان تخلیقات کی ادبی شان ترجموں میں بھی برقرار ہے کیونکہ مترجمین خود انھیں ادبی قدروں کو عزیز رکھتے ہیں جو ان مختلف افرو ایشیائی ادیبوں کو عزیز ہیں۔ ان ادب پاروں پر تفصیلی تبصرہ کا موقع نہیں ہے لیکن مختصراً چند اشارے کرنا ضروری ہے تاکہ ان کا مطالعہ کرنے والے انھیں صحیح پس منظر اور عصری افکار کی روشنی میں دیکھ سکیں۔ الجزائر کی کہانی تعویذ کا طلسم اپنے اندر وہ کرب، تلخی اور غم کی رکھتی ہے جو برسوں کی غلامی اور آزادی کی جدوجہد میں وجود کا جزو بن گئی تھی لیکن اُیدمر نے نہیں پائی ہے، اپنے گھروں میں واپس جا نے ،

کھیتوں میں اناج اگانے اور زندہ رہنے کی خواہش باقی رہتی ہے۔ ایرانی کہانی کا طبقاتی کردار نمایاں نہایت پُرسوز اور ڈرامائی رنگ میں جلتی ہوئی انسانی کہانی۔ افلاس، بے رحمی، خود غرضی کی داستان جس کے پیچھے شدید طنز چھپا ہوا ہے۔ پاکستان کا افسانہ نگار بھی سماجی نظام کے اسی کھوکھلے پن کا افسانوی اظہار کرتا ہے۔ یہاں بھی حقیقت اور طنز کے ملے جُلے انداز نے افسانہ میں غیر معمولی حسن پیدا کر دیا ہے۔ ترکی کی کہانی میں دفتر شاہی کا مذاق ایسے دلکش انداز میں اُڑا گیا ہے کہ افسانہ نگار کی دقتِ نظر، مشاہدہ اور قوت اظہار کا نقش دل پہ بیٹھ جاتا ہے۔ جاپان کی کہانی ایک حسین فن پارہ ہے جس میں ایک پُرسوز گیت کا حُسن چھپا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کی کہانی وہاں کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے گہری معنویت کی حامل ہے۔ جنوبی ویت نام گھریلو پُرسکون ماحول کے لیے کس طرح تمنا رہا ہے "ننھی گھڑاؤں" میں سورج سے زیادہ روشنی ہے۔ چین کا افسانہ محض ایک نفسیاتی تاثر کے ذریعہ انسانی احساس کو جھنجھوڑتا ہے۔ شمالی ویت نام کی کہانی پُراسرار اور ڈرامائی مواقع سے بھری ہوئی ہے اور اس کی زندگی کے ایک سادہ سے واقعہ پر مبنی ہے۔ جہاں آگ اور خون میں جھیلنے کے بعد بھی انسانی محبت فطرت کے مطابق اپنا نقش آہستہ آہستہ بناتی ہے۔ کرغیزیہ کے افسانہ نگار نے ایک خالص نفسیاتی انسانی داستان سنائی ہے جو لطیف ہے۔ کینیا کے کہانی کار نے نسلی نفرت انگیزی کی بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ مصری کہانی محبت اور خدمت کی حسین آمیزش سے بڑی پُراثر بن گئی ہے۔ منگولیا کے کہانی کہنے والے نے ایک نقش قدیم داستانی علامت کے چوکھٹے میں ابھارا ہے جس سے زندگی اور فن کے رشتہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ نائجیریا کی کہانی واقعہ نگاری کی خوب صورت مثال ہے اور آخر میں ہندوستان اپنا دکھڑا سُناتا ہے جو آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی آسودہ حالی سے محروم ہے۔ نیپال بھی یہی داستان سناتی ہیں۔

یہ چند خون کے قطرے ہیں جن میں افریقہ اور ایشیا کے نظام حیات کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے مجھے یقین ہے کہ افرو ایشیائی مصنفین کانفرنس کے موقع پر یہ شمارہ ہمارے دلوں میں وسعت اور باہمی اشتراک کے جذبات پیدا کرے گا۔

سجاد ظہیر
نائب صدر ہندوستانی تیاری کمیٹی
برائے چہارم افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس

افریقہ اور ایشیا کے ادیبوں کی تحریک: ایک مختصر جائزہ

ہندوستانی ادیبوں کو اس بات پر بجا فخر ہو سکتا ہے کہ افریشیائی ادیبوں کی تحریک، جس کی عمر اب بارہ سال ہے، ہندوستان سے شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک کی بنیاد دسمبر ۱۹۵۶ کے آخری ہفتے میں نئی دہلی میں رکھی گئی جب کہ یہاں ایشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا خیال سب سے پہلے افریشین اتحاد کی کانفرنس نے پیش کیا تھا جو اکتوبر ۱۹۵۶ میں حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اور چند دیگر ہندوستانی ادیبوں نے، جو عالمی امن تحریک اور افریشیائی اتحاد کی تحریک سے وابستہ تھے، اس خیال کو پسند کیا اور ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کا انتظام کرنے کے واسطے ایک تیاری کمیٹی بنائی گئی۔ متذکرہ بالا دونوں بحا تنظیموں کی مدد سے اس کمیٹی کے لئے ممکن ہو سکا کہ ہندوستان کے باہر تمام ترقی پسند ادیبوں اور ادبی تنظیموں سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔ جب جواہر لال نہرو کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو انھوں نے بھی ہندوستان میں ایشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس بلانے کے خیال کو پسند کیا اور اس سے متفق ہوئے۔ ایک سال پہلے ان ہی نے ایشیائی اتحاد کی کانفرنس کو شروع کرنے کا اقدام کیا تھا۔

ان واقعات اور اس پس منظر کی سند دینا اس لئے ضروری ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ہنوز غلام قوموں میں بیداری اور جدوجہد آزادی کی جو زبردست لہر اٹھی اس نے مغربی نوآبادیات و شہنشاہیت کی بنیادیں ہلا دیں، چنانچہ ہمیں یہ نہ

بھولنا چاہیے کہ ایشیائی ادیبوں کے متحد ہونے کا خیال بھی اسی عظیم و وسیع تہ دھارے کا ایک حصہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایشیا کے زیادہ تر ملک اور ان میں بھی سب سے بڑے یعنی ہندوستان، چین، انڈونیشیا یا پاکستان وغیرہ آزاد نہ ہوتے تو ایشیائی ادیبوں کے لئے کسی اجتماع یا کانفرنس کی صورت میں یکجا ہونا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ سوویت یونین، چین اور پورا ہی سوشلسٹ کیمپ، قوموں کی آزادی اور شہنشاہیت دشمنی و سوشلزم کے ایک ایسے زبردست قلعہ کا رول ادا کر رہا تھا جس کے اثرات روز بروز بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

پہلی ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں سوویت یونین، چین، انڈونیشیا، پاکستان، برما، جاپان، سیلون، نیپال، کوریا، ویتنام، فلپین، ایران وغیرہ کے ادیبوں نے حصہ لیا۔

بدقسمتی سے اس کانفرنس میں عرب ممالک کی نمائندگی بخوبی نہ ہو سکی کیوں کہ اس وقت تک ان ملکوں میں سے کئی مثلاً عراق، شام، لبنان، یمن، سعودی عرب وغیرہ پر کسی نہ کسی طرح شہنشاہیت حاوی تھی، مگر ہم متحدہ عرب ممالک (مصر وغیرہ) کی نمائندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ کانفرنس میں ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی کافی تھی، ہماری سب ہی بڑی زبانوں کے تقریباً دو سو ادیب شریک ہوئے۔ ہر زبان سے اس کے ادب کی رپورٹ پیش کی گئی۔ بعض نے ایک سے زیادہ رپورٹیں پیش کیں، بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے سامنے یہ بہت بڑا مرحلہ تھا کہ کہیں ہندوستانی ادیب ہی نہ کانفرنس پر چھا جائیں۔ یہ موقعہ کئی لحاظ سے تاریخی تھا۔ اول تو یہ کہ پہلے کبھی ایشیاء کے اتنے ملکوں کے ادیب ساتھ نہیں مل بیٹھے تھے، دوسرے یہ کہ ہندوستان کی بڑی زبانوں کے اور اتنے قسم کے خیالات رکھنے والے ادیب پہلے کبھی یکجا نہیں ہوئے تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ جہاں زیادہ تر ایسے ہندوستانی ادیب تھے جن کو فی الجملہ ترقی پسند، جمہوریت پسند، اور انسان دوست کہا جا سکتا ہے، وہاں ایک چھوٹا سا گروہ ایسا بھی تھا جو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ حالات سے مجبور ہو کر شریک ہوا تھا۔ اس گروہ کا شہنشاہیت پسندوں یا شہنشاہیت پسند رجحانات کے ذرائع مثلاً کانگریس آف کلچرل فریڈم وغیرہ سے بالواسطہ

یا بلا واسطہ تعلق تھا۔ سیاسی و اخلاقی سطح پر یہ میکارتھی قسم کی غیر صحت مند کمیونسٹ دشمنی کا شکار تھے۔ چنانچہ اس گروہ نے کانفرنس کمیٹیوں کے اندر جھگڑے اور باہر رجعت پسندوں کے پریس کے ذریعہ جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے کانفرنس کو بدنام کرنے بلکہ ناکام بنانے کی کوشش کی۔ بہرحال کانفرنس میں کھلے بندوں یہ نہایت درجہ اقلیت میں رہے اور ان کی تمام چالبازیاں بری طرح ناکامیاب ہوئیں۔

میرے خیال میں اس کانفرنس کی سب سے بڑی اہمیت یہ تھی کہ اتنے بہت سے آزاد ایشائی ملکوں کے ادیب اور سوویت یونین کے ادیب ایک دوسرے سے، انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ملے۔ پہلی بار ہم ایک دوسرے سے اس طرح واقف ہوئے کہ ہم میں باہمی ادب و تہذیب کو اور زیادہ جاننے کی خواہش اور ادیبوں کی ایک وسیع تحریک جاری کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ ہم اپنی بہترین تخلیقات ایک دوسرے تک پہونچا سکیں اور اپنی روح کی تڑپ، مسرت و غم، احساسات، خیالات، اپنے خواب اور امیدیں جو ہماری تخلیقی کوششوں کے ذریعہ ہمارے ادب میں اظہار پاتی ہیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہم ایک ہی جھنڈے تلے کھڑے ہیں۔ سب کی آزادی اور خوشحالی کا جھنڈا جس کو اٹھا کر ہی ہم اپنی قوموں کے لئے امن اور ایک خوب صورت تہذیبی وجود حاصل کر سکتے ہیں، اپنی تازہ حاصل کی ہوئی آزادی کو برقرار رکھ سکتے ہیں، شہنشاہیت کے استحصال، جاگیرداری، رجعت پسندی کے کھنڈروں کو صاف کر سکتے ہیں، اپنی گزشتہ شاندار تہذیب کو از سرِ نو زندہ کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ادیبوں، شاعروں کو تنظیم کرنا نہیں آتا اور شاید یہ بات کسی قدر ٹھیک بھی ہے چنانچہ ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں بس ایک ہی رزولیوشن منظور ہوا ـــــ اور وہ یہ کہ دو سال بعد، ازبکستان کے دارالسلطنت تاشقند میں پھر کانفرنس ہو، اس کا دعوت نامہ سوویت ادیبوں کی انجمن کی طرف سے ازبکستان کی دلکش شاعرہ زلفیہ خانم نے پیش کیا۔ ہماری کانفرنس نے بڑی خوشی سے شکریئے کے ساتھ اس دعوت کو قبول کیا۔

جب ہمارے سوویت ادیب دوستوں نے اپنے یہاں کانفرنس کی تیاری کے لئے بین الاقوامی کمیٹی بلائی تو اس میں ملک راج آنند، سنت سنگھ سیکھوں اور گوپال ہلدار ہندوستان کی نمائندگی کرنے گئے۔ اس کمیٹی میں چینی، جاپانی اور انڈونیشیائی نمائندے بھی شریک ہوئے۔ اس کمیٹی کا اہم فیصلہ یہ تھا کہ کانفرنس میں افریقی ادیبوں کو بھی شامل کرکے اسے وسیع تر بنایا جائے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۸ میں جو کانفرنس تاشقند میں ہوئی وہ افریشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس تھی۔ واضح رہے کہ ۱۹۵۶ ہی سے افریقی ملکوں نے شہنشاہیت اور نوآبادیات کا جوا نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اتار پھینکنا شروع کردیا تھا اور ۱۹۵۶ سے ۶۵ تک کی دہائی میں ۳۴ افریقی ملکوں نے آزادی حاصل کرلی تھی۔

جن خوش نصیبوں کو پہلی افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کا موقعہ ملا ان کے لئے وہ ایک ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔ مجھے بھی یہ سعادت حاصل ہوئی تھی۔ اول تو یہ کہ ہم سب ہی مرکزی ایشیا کی اس قدیم سرزمین، ازبکستان اور اس کے دارالسلطنت تاشقند سے بے حد متاثر تھے۔ نہ صرف ہمارے میزبانوں، سوویت اور ازبیکی ادیبوں، ان کی حکومت، ان کے رہنماؤں وغیرہ نے بڑی خاطر اور محبت سے ہمارا استقبال کیا اور پرتکلف میزبانی کی بلکہ وہاں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ساری قوم، مرد، عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل کر گلیوں، چوکوں، سڑکوں، پارکوں میں اکٹھا ہوگئے ہیں۔ کانفرنس کے دوران پورے ایک ہفتے تک شام اور رات کو چراغاں ہوتا تھا۔ تاشقند کی سڑکوں کے آرپار تنے ہوئے جھنڈوں پر کئی کئی زبانوں میں ایشیا، افریقہ کے ادیبوں کے لئے خوش آمدید کے الفاظ، انگریزی، فرانسیسی، عرب، اسپینی، چینی، روسی، ہندی وغیرہ میں لکھے نظر آتے تھے۔ جب غیر ملکی ڈیلیگیٹ ہوٹلوں سے نکل کر کانفرنس ہال کی طرف جاتے تو ازبیکی دوست، مرد عورتیں انھیں گھیر لیتے۔ پھول اور چھوٹے چھوٹے تحفے پیش کرتے۔ ہندوستانی ڈیلیگیٹ اور خاص کر ہمارے لمبی داڑھیوں پگڑیوں والے سکھ ادیب تو بالخصوص مقبول تھے۔

تاشقند کانفرنس میں ۴۱ ایشیائی افریقی ملکوں کے ادیب، ڈیلیگیٹ آئے تھے اور سب ملکوں کے لیڈر کانفرنس کی مجلس صدارت میں بیٹھتے تھے۔ ہمارے خاص میزبان اور افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے لئے منتظم کمیٹی کے صدر شرف رشید وف تھے ـــــ دراز قد، وجیہہ، نرم گفتار ازبک ادیب جو ایک معزز سماجی شخصیت اور کمیونسٹ پارٹی ازبکستان کے جنرل سکریٹری بھی ہیں۔ تاشقند میں غالباً سب سے زیادہ متاثر کن عمارت نودی اوپیرا ہاؤس ہے اور اسی کے سب سے بڑے اور وسیع ہال میں کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ کانفرنس کے نام اپنا ایڈریس پڑھتے ہوئے شرف رشید وف صاحب نے فرمایا:

"ہمارے دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کی قومیں اپنی بیداری و ترقی کے موسمِ بہار تک پہونچ رہی ہیں بہار کے طوفانوں کے بعد زمین زندگی سے لبریز ہو جاتی ہے، نم ہو جاتی ہے، نئے نئے انکھوے پھوٹ کر زمین سے اوپر اپنا سر اُٹھاتے ہیں، روشن آسمان کی طرف جھانکتے ہیں، ان کا رخ آفتاب کی طرف ہوتا ہے جو اندھیرے بادلوں کو چیر کر نکلتا ہے پھر ہر چیز میں جان پڑ جاتی ہے، وہ نشو و نما پاتی اور کھل اٹھتی ہے۔ بہار کے طوفانوں کی طرح مشرقی قوموں کی جد و جہد آزادی بھی، ایشیا، افریقہ کے لامتناہی کناروں تک شہنشاہیت کے اندھیرے بادلوں کو چیر رہی ہے۔ اُن کی یہ حق بجانب، عظیم جد و جہد، غلامی اور محکومی کے تمام کوڑا کرکٹ کو صفحۂ دنیا سے نیست نابود کر کے، ہر نئی چیز کو جوان، صحت مند اور پُر مسرت بنا دے گی۔"

ازبکستان کی خوش اطوار و مہذب شاعرہ زلفیہ خانم سے ہم دو سال پہلے دلی میں بھی مل چکے تھے، انھوں نے اس کانفرنس سے اُبھرنے والے "جذبہ تاشقند" کی یوں تفسیر کی:

"میرے لئے "جذبۂ تاشقند" کے معنی یہ ہیں کہ ادیبوں میں باہمی مفاہمت پیدا ہو وہ ایک مقصد کے لئے متحد ہو کر کوشش کریں اور وہ مقصد یہ ہو کہ ایک عظیم عالمی ادب

جو انسان کے نام معنون ہو ــــ خوش حال اور شاندار آدمی کے نام جو آزاد و شاندار دنیا کا باشندہ ہو۔ ایسا ادب تخلیق ہونے کی شرط اوّلیں یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا جائے جو جسم انسانی کو تکلیف پہونچاتی اور ذہن انسانی کو مسخ کرتی ہیں ــــ نوآبادیات شہنشاہیت کی پیدا کی ہوئی بدعنوانیاں اور ذلتیں، قوموں میں تفرقہ، انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال"۔

چونکہ یہ کانفرنس سوویت یونین میں ہوئی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ سوویت ادیبوں کا گروہ سب سے کثیر تھا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن سے ہم غائبانہ طور پر، ان کی تخلیقات کے ذریعہ واقف تھے اور کچھ سے ہم دہلی کی ایشیائی کانفرنس میں مل چکے تھے۔ ان میں روس کے معزز شاعر نکولائی تخونوف، کانستانتن سمولوف، فیدن الگزنڈر چکووسکی (جو اس وقت سوویت رسالے "بین الاقوامی ادب" کے ایڈیٹر تھے اور اب "لٹریری گزٹ" کے ایڈیٹر ہیں)، مرزا ترسون زادہ (جو تاجیک ہیں اور اس لئے میں ان سے فارسی میں بات چیت کر لیتا تھا)، زلفیہ خانم، بیردی کاربابائیف (ترکمینیا کے ناول نگار)، چنگیز ایتماتوف (کرغیزیہ کے نوجوان ادیب، ناول "جمیلہ" کے مصنف)، مختار اوزائیف (کازکستان کے ناول "ابائے" کے مصنف)، رسول حمزتوف (داغستان کے شاعر)، عبداللہ قہار اور ایک ازبکی ناول نگار)، غفور غلام (ازبکستان کے سربرآوردہ شاعر) وغیرہ۔ ہندوستانیوں کو اپنے سوویت ایشیائی ساتھی ادیبوں سے مل کر خاص خوشی تھی کیونکہ ان سے ہمارے صدیوں پرانے رشتے ہیں۔ واتکا کے زمانے سے جب کہ بدھ مت مرکزی ایشیا میں پھیلا، بابر کے زمانے سے جب وہ فرغانہ سے آیا اور مغل حکومت کی بنیاد ڈالی ــــ ہمارے دو عظیم ترین شاعروں، امیر خسرو اور مرزا غالب کے آباؤ اجداد ازبکستان ہی سے ہندوستان آئے تھے۔

تاشقند کانفرنس میں شریک ہونے والا ڈیلیگیشن اب تک ہندوستان سے باہر

جانے والے تمام ڈیلیگیشنوں سے بڑا تھا اور اب تک اس سے بڑا ادیبوں کا ڈیلیگیشن کبھی باہر نہیں گیا۔ تاشقند میں بھی باہر سے آنے والوں میں ہمارا ہی گروہ سب سے بڑا تھا۔ اس میں ۲۸ ممبر تھے جن میں تاراشنکر بنرجی ڈیلیگیشن کے لیڈر تھے اور پھر ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی، ڈاکٹر ملک راج آنند، گوپال ہلدار، راجندر سنگھ بیدی، کے۔ دامودرن، یشپال، سنت سنگھ سیکھوں، سُبھاش مکھ پادھیائے، غلام ربانی تاباں، گور بخش سنگھ، آنند اپٹنائک، لکشمی بائی چنداوت، پربھجوت کور، کے۔ این۔ بشری دھرانی، پربودھ کمار سانیال، ایس۔ ایس۔ چوہان، پراگ جی دوسہ، سجاد ظہیر وغیرہ تھے۔

کانفرنس کی کمیٹیوں و دیگر پارٹیوں، دعوتوں میں افغانستان، برما، کمبوڈیا، سیلون، چین، سائپرس، انڈونیشیا، عراق، جاپان، جورڈن، کوریا، منگولیا، نیپال، پاکستان، فلپین، تھائی لینڈ، ترکی (جس کی نمائندگی عظیم شاعر ناظم حکمت کر رہے تھے) ویت نام، الجیریا، انگولا، کیمرون، گھانا، نائجیریا، سینیگال، موزمبیق، سومالیہ، سوڈان، داہونگ، متحدہ عرب ممالک، یوگنڈا، گابون، موریشس، گیانا، مدغاسکر اور آئیوری کوسٹ کے ادیبوں سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ سوویت یونین اور ہندوستان کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

تاشقند کانفرنس میں کئی اہم انتظامی فیصلے کیے گئے جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ ایشیائی ادیبوں کی تحریک کے مستقل بیورو، گھانا، کیمرون، چین، متحدہ عرب ممالک، سوویت یونین، سوڈان، جاپان، ہندوستان اور سیلون میں قائم کیے جائیں۔ اس کے علاوہ تحریک کے اغراض و مقاصد کی باقاعدہ تعریف و تشریح کی گئی یعنی افریشیائی ادیبوں اور ان کی تنظیموں میں رابطہ پیدا کرنا، افریشیائی ملکوں کے ادب کے ترجمے و تبادلے کا بندوبست، نوآبادیات، نئی نوآبادیات اور شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد میں افریشیائی قوموں کا ساتھ دینا وغیرہ۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ہر تین سال بعد افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہو اور اگلی کانفرنس متحدہ عرب ممالک میں کرنا طے پایا۔

اس طرح تاشقند کانفرنس نے افریشیائی ادیبوں کی تحریک کو ایک متین و مستقل صورت بخشی اور اب یہ افریشیائی ادیبوں اور خاص کر ان دس ملکوں کے نمائندوں کی ذمہ داری تھی (جو مستقل بیوروؤں کے ممبر تھے) کہ تحریک کے یہ اغراض و مقاصد باقاعدہ و منظم طریقے سے پورے ہوتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں میں سب سے اہم مرحلہ یہ تھا کہ ہم اپنے افریشیائی ادب کی بہترین کتابوں اور تخلیقات کو ترجمہ کریں، چھاپیں اور آپس میں اس کا تبادلہ کریں۔ یہ کام مستقل بیورو اور مختلف ملکوں کی اپنی قومی کمیٹیوں —— دونوں ہی کی ذمہ داری تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں وقتاً فوقتاً مخصوص ادبی موضوعات پر مباحثے، سیمینار اور اجتماعات کی تنظیم بھی کرنی تھی۔ ان کاموں کو بخوبی انجام دینے کے لئے خاصے مالی و دیگر ذرائع کی ضرورت تھی۔

افریشیائی ادیبوں کی دوسری کانفرنس قاہرہ (متحدہ عرب) میں ہوئی۔ ویسے یہ کانفرنس اتنے وسیع و شاندار پیمانے پر تو نہیں تھی جتنی کہ تاشقند کانفرنس، مگر نمائندگی اس میں بھی کم نہ تھی یعنی ۴۲ افریشیائی ملکوں کے ادیب وہاں موجود تھے۔ ہندوستانی وفد کے ۹ ممبر تھے اور وفد کی سربراہی ڈاکٹر ملک راج آنند نے کی۔ ممبروں میں سبھاش مکھوپادھیائے، شنکر شیلندر، پراگ جی ڈوسہ، سجاد ظہیر وغیرہ تھے۔ چینی وفد میں ۱۲ ممبر تھے اور چینی عوامی ریپبلک کے مرکزی وزیر اور مشہور ادیب ماؤتون اس کے سربراہ تھے۔ سوویت ادیبوں کی رہنمائی ترسون زادے نے اور ترکی کی نمائندگی ناظم حکمت نے کی۔ الجیریا اس وقت تک آزاد نہیں ہوا تھا مگر اس کے وفد میں کاتب یٰسین اور مالک حداد ایسے معروف الجیریائی ادیب تھے۔ چار ممبروں کے اس الجیریائی وفد میں مجھے نوجوان ادیب احمد حمی بھی یاد ہیں، ایک سال بعد وہ آزاد الجیریا کی حکومت میں امور خارجہ کے پہلے وزیر مقرر ہوئے مگر افسوس کہ اس کے فوراً ہی بعد یہ ہونہار نوجوان اپنے ہی ایک ہم وطن کی گولی سے شہید ہوا۔

اگرچہ قاہرہ کانفرنس کے تمام فیصلے، کانفرنس کا اعلان نامہ اور تنظیمی فیصلے وغیرہ بالاتفاق رائے منظور ہوئے مگر بدقسمتی سے کچھ خاص ایسے مسائل کانفرنس کے سامنے اٹھ کھڑے ہوئے جو خاص طور پر چینی وفد کے نظریاتی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوگئے۔ یہ اختلافات کانفرنس کے کھلے اجلاسوں

میں تو نہیں لیکن مختلف کمیشنوں میں بار بار ابھر کر سامنے آتے رہے۔ چنانچہ ایک کمیشن میں ایک چینی نوجوان نے ناظم حکمت کے اٹھائے ہوئے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ناظم نے عوام کے مفاد کو ترک کر دیا ہے اور شہنشاہیت پرست ہو گئے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ناظم حکمت صرف ایشیا ہی نہیں بلکہ دنیا کے ترقی پسند انقلابی شاعروں میں بلند ترین درجہ رکھتے تھے۔ ترکی کی رجعت پسند حکومت نے انھیں سزائے موت دی تھی اور اس کے بعد انھوں نے اپنی جوانی کے طویل سال ترکی کے جیل خانوں میں بسر کئے اور یہ سب کچھ صرف اسی لئے ہوا کہ وہ ایک حق پرست عوامی اور انقلابی شاعر تھے۔ چینی ڈیلیگیٹ کے اس جملے سے نہ صرف ناظم کو خود غصہ آیا بلکہ کمیشن میں موجود تمام ڈیلیگیٹ طیش میں آ گئے! اس کمیشن میں ماؤ تون خود موجود نہیں تھے مگر میرا خیال ہے کہ بعد کو انھوں نے بیچ میں پڑ کر بات کو رفع دفع کر دیا۔ بہرکیف اس واقعے سے یہ ضرور ظاہر ہو گیا کہ کانفرنس کے اندر شدید نظریاتی اختلافات پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک طرف چینی ہوتے تھے تو دوسری طرف دوسرے ڈیلیگیٹوں کی اکثریت ہوتی تھی۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنے چینی دوستوں کے اس رویہ پر بے حد رنجیدہ اور حیران تھے کہ وہ اس نتیجے پر کیسے پہنچے کہ کل جو ان کے ساتھی تھے وہ آج یکایک رجعت پسند ہو گئے ہیں۔

قاہرہ کانفرنس نے انڈونیشیا کے وفد کا دعوت نامہ قبول کرتے ہوئے تیسری افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس انڈونیشیا میں کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر بدقسمتی سے انڈونیشیا کے اندرونی حالات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ انڈونیشیا کی رجعت پسند حکومت نے تمام ترقی پسند اور جمہوری تہذیبی انجمنوں کی طرح انڈونیشیا کی طاقتور ادیبوں کی انجمن کو بھی کچل دیا۔ ساتھ ہی ایک اور یہ واقعہ بھی ہوا کہ کولمبو میں ہمارے مستقل بیورو کے سکریٹری رتنا دیش پریہ سینا نائکے کی گورنمنٹ سیلونی ادیبوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ کولمبو کا مستقل بیورو کا دفتر وغیرہ بند کر کے پیکنگ چلے گئے اور

وہاں سے انھوں نے اور ملکوں کے صلاح مشورے اور اجازت کے بغیر بیانات دینے شروع کر دیے۔ چین میں تہذیبی انقلاب زور و شور سے جاری تھا اور چینی ادیبوں کے کچھ رہنما جیسے ماؤ تون اور چاؤ یانگ منظرِ عام پر سے غائب ہو گئے تھے۔

ان حالات کے تحت قاہرہ میں جو افریشیائی ادیبوں کا مستقل بیورو تھا اس کے ممبروں کی اکثریت نے جون ۱۹۶۶ میں بیورو کی ایک میٹنگ قاہرہ میں بلائی۔ اس میٹنگ نے فیصلہ کیا کہ افریشیائی ادیبوں کی تیسری کانفرنس بیروت (لبنان) میں ہو اور اس مقصد کے لئے نومبر ۱۹۶۶ میں ایک بین الاقوامی تیاری کمیٹی پھر قاہرہ میں بلائی گئی۔ اس تیاری کمیٹی میں الجیریا، انگولا، ہندوستان، عراق، جاپان، کیمرون، لبنان، منگولیا، موزمبیق، جنوبی افریقہ، سوڈان، ترکی، متحدہ عرب اور سوویت یونین کے نمائندہ ادیب شریک ہوئے۔ متحدہ عرب کے یوسف السباعی ہماری تحریک کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ اور افریشیائی ادیبوں کی تیسری کانفرنس کے لئے تیاری کا دفتر نیز مستقل بیورو قاہرہ میں قائم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ چینی بھی اس بیورو کے ممبر تھے مگر انھوں نے ہمارے دعوت نامے کو نظر انداز کر دیا بلکہ پیکنگ میں افریشیائی ادیبوں کی ایک اور میٹنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس میٹنگ کی حقیقت کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اس میں ہندوستان کی نمائندگی جن صاحب نے کی، ان کا نام منجندا تھا اور وہ ہندوستان چھوڑ کر برطانیہ میں جا بسے تھے۔ میں منجندا کو پنجاب کے ایک ایسے معمولی کمیونسٹ کارکن کی حیثیت سے جانتا تھا جو سنہ ۴۰ کے بعد انگلستان جا بسے تھے، وہاں ہندوستانی مزدوروں کی انجمن میں کام کرتے تھے اور بعد کو ماؤ کے پیرو ہو گئے تھے۔ انھوں نے ادب کی ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی۔ چینی لوگوں کو ایک عقلمند قوم مانا جاتا ہے حیرت ہے کہ وہ اس خود فریبی میں کیسے مبتلا ہوئے کہ منجندا جیسے لوگ ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگوں کو نہایت غم کے ساتھ یہ دیکھنا پڑا کہ بیروت اور قاہرہ، دونوں جگہ چینیوں کی نشستیں خالی رہیں اور ان کی نمائندگی نہیں ہوئی۔

انھوں نے ہمارے دعوت ناموں کا جواب تک نہیں دیا۔

مارچ ۱۹۶۷ کے آخری ہفتے میں افریشیائی ادیبوں کی تیسری کانفرنس لبنان کے دارالسلطنت بیروت میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے تاثرات ابھی تک میرے ذہن میں بالکل تازہ ہیں، لبنان دنیا کی سب سے قدیم و مہذب ترین سرزمینوں میں سے ہے۔ علم کے متلاشیوں اور ادیبوں کے لئے اس کی مخصوص اہمیت ہے۔ دنیا کا سب سے پرانا زندہ شہر بھی لبنان ہی میں ہے جو پانچ ہزار سال قبل مسیح سے موجود ہے۔ اسی مقام پر اہرام بابلوس کے ایک بادشاہ کے سنگین مقبرے پر اوّلین ابجد کندہ ہے جو بارہویں صدی قبل مسیح کندہ کیا گیا تھا۔ ۲۲ حروف کے اسی ابجد سے دنیا کی تمام زبانوں کے حروف (جن میں سارے ہندوستانی حروف بھی شامل ہیں) پیدا ہوئے۔ بلاشبہ ابجد انسان کی زبردست ترین ایجادوں میں سے ایک ہے۔ اسی کی بدولت تحریر وجود آئی جو علم انسانی کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

بیروت کانفرنس میں جن ملکوں کو شرکت کی دعوت دی گئی اُن کی فہرست اب تاشقند کانفرنس کے مقابلے میں بہت بڑھ گئی تھی اور بیروت میں ایشیا افریقہ کے ۵۹ ملکوں کے ادیب مدعو کئے گئے اور چالیس ملکوں سے زیادہ کے نمائندہ ادیب شریک ہوئے پہلی کانفرنسوں کی طرح یہاں بھی زیادہ تر وقت ملکوں کی ادبی رپورٹیں سننے میں گذرتا تھا۔

ہندوستانی وفد میں ڈاکٹر ایچ آر بچن (لیڈر) ڈاکٹر ملک راج آنند، اختر الایمان، سبھاش مکھوپادھیائے، پراگ جی ڈوسہ، سریندر بالوپوری اور سجاد ظہیر تھے۔

جنوبی ویتنام کے ادیبوں اور فن کاروں کی انجمن کے نمائندے خان تو، ہونیہ وان لی تھے اور ویت نامی ادیبوں کی انجمن کی نمائندگی توہوئے (جن کو ۱۹۷۰ کا کنول انعام ملا ہے) اور ہوانگ ترونگ تھانگ نے کی تھی۔ ان ادیبوں نے کانفرنس بھر میں سب سے زیادہ موثر رپورٹ پیش کی۔

توہوئے نے اپنی تقریر میں فرمایا "غیر ملکی مہمان جب ہنوئے آتے ہیں تو مسکرا اٹھوں

پھولوں سے ان کا استقبال ہوتا ہے اور آج اس وقت بھی امریکن بمبار ہماری بہار کے پھولوں کو تاراج کر رہے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ ترقی پسند انسانیت کا تمام غم و غصہ ہمارے ساتھ ہے اور اسی لئے ہمارے حوصلے آج بھی بلند ہیں اور دل امید سے لبریز! ہمیں یقین ہے کہ ہم حق پرستی اور انصاف کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ہم ضرور فتحیاب ہوں گے۔"

پوری بیروت کانفرنس نے کھڑے ہو کر دیر تک ویت نامی ادیبوں کے الفاظ پر تالیاں بجائیں۔

چونکہ کانفرنس ایک عرب ملک میں ہو رہی تھی اس لئے عرب ملکوں کے ادیبوں کی تعداد کافی تھی اور ان میں فلسطین کے ادیبوں نے کانفرنس سے سب سے زیادہ داد تحسین حاصل کی۔

کانفرنس نے ویت نامی و عرب مجاہدین آزادی کی حمائت میں بیانات کو پرجوش اتفاق رائے سے منظور کیا۔

افریشیائی ادیبوں کی انجمن کے نئے آئین کو بھی بیروت کانفرنس نے منظور کیا۔ قاہرہ میں مستقل بیورو قائم کر کے یوسف السباعی کو اس کا جنرل سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ ہندوستانی ادیبوں کی جانب سے چوتھی افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہندوستان میں کرنے کی دعوت دی گئی۔ کانفرنس نے اس کو قبول کیا۔

اور اب ۱۶ نومبر سے ۲۰ نومبر تک ایک بار پھر ہمیں اپنے افریقی اور ایشیائی ساتھیوں کی میزبانی کا فخر حاصل ہوگا۔ اس مقصد کے لئے ہندوستانی تیاری کمیٹی نے تقریباً دو سو ہندوستانی ادیبوں کا تعاون حاصل کر لیا ہے۔ اس کمیٹی کے صدر ہمارے معزز ادیب و عالم ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی اور سکریٹری ۱۹۵۶ کی طرح ڈاکٹر ملک راج آنند ہیں۔ کانفرنس کی حمایت میں ہمارے وسیع ملک کے مختلف تہذیبی حلقوں و علاقوں مثلاً بنگال، اتر پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، دہلی وغیرہ میں کنونشن کئے جا رہے ہیں۔

آئیے، ہم امید کریں کہ یہ کانفرنس جو مشہور وگیان بھون، نئی دہلی میں ہوگی، وہ افریشیائی ادیبوں کی یکجہتی اور اتحاد کو مضبوط تر بنائے گی اور یہ امراپنی جگہ ویت نام کمبوڈیا، لاؤس، عرب، مغربی ایشیا، انگولا، موزمبیق، زمبابوے، جنوبی افریقہ وغیرہ کی قوموں کی جدوجہد آزادی و خوش حالی کو قوت پہنچائے گی۔ اور اس طرح ہم سب کو یہ توفیق ہوگی کہ اپنی تخلیقاتی کوششوں سے انسان کے لئے ایک نئی اور بہتر تہذیب کی تعمیر کرسکیں — ایک ایسی تہذیب جس کی بنیادیں عقل پسندی، انسانی مساوات، آزادی اور سب کی خوش حالی پر رکھی جائیں۔ ایسی تہذیب جو شہنشاہیت، نوآبادیات، رنگ و نسل کے فرق، جنگ کی تباہ کاریوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کردے، انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال سے پیدا ہونے والی روحانی ذلت و پستی کو سدا کے لئے نیست و نابود کردے۔

انگریزی سے ترجمہ:
رضیہ سجاد ظہیر

الجزائر — محمد دیب

تعویذ کا طلسم

میں وطن واپس آچکا ہوں۔ یہ خواب نہیں ہے کہ میں نے اپنے پہاڑوں کو دوبارہ پالیا ہے۔ جب میں اپنی پیٹھ اس گاؤں کی طرف کرتا ہوں تو راستے کے موڑ پر ایک ڈھلان کے پیچھے وادی نمودار ہوتی ہے۔ اس جگہ سڑک کو چھوڑ کر چڑھائی کے راستے پر چلنا پڑتا ہے جو وادی کے دامن سے ہو کر بلندی کی طرف جاتا ہے۔ اس وادی کے اوپر خلیج نما سی کوئی چیز ملتی ہے۔ اچانک انسان کو اس سے بھی زیادہ تنہائی محسوس ہونے لگتی ہے جتنی کہ دیں سمندروں میں محسوس ہوتی ہے۔

یہاں کے مکانات کچی اینٹ گارے کی جھونپڑیاں اور پتھروں سے تراشے ہوئے غار ہیں۔ یہی وہ مکانات ہیں جنہوں نے مجھے پیدا ہوتے، بچپن میں کھیلتے اُچھلتے دیکھا ہے۔

یہاں کی زمین کے اکثر حصوں پر اینٹ، پتھر اور بھٹیاں، جن میں اب بھی راکھ موجود ہے۔ کچھ بڑے بڑے بانس اور ڈنڈے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ساکت اور مقد درخت آسمان سے گرنے والی بوندوں سے خود کو بچانے کے لئے اپنی شاخوں کو ڈھال بنائے ہوئے ہیں۔

پہاڑ کی سطح پر جہاں دھوپ سے جلے ہوئے جنگلی پودے ہیں وہاں ہوا ایک پُراسرا لیکن حزنیہ دھن بجاتی ہوئی، ان خاموش روحوں سے مطابقت رکھتی معلوم ہوتی ہے جو اس سرزمین پر بسی ہوئی ہیں۔ یہ گم شدہ روحیں خود سامنے کی ویران سرزمین سے آئی ہیں جو کہ

اور سیاہ درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

کیا میرے ہمسائے بھی واپس آجائیں گے؟ ہو سکتا ہے، لیکن کون جانے! یہ لمبے چوڑے میدان جن کے ایک ایک انچ کے لئے انھوں نے مقابلہ کیا تھا، اپنی سنگلاخ سرزمین پر ان پہاڑوں کے انتشار کے درمیان خاموشی سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔ لیکن اب ایک اور منظر ان کے انتظار میں ہے۔

وہ سڑک جو مجھے پیچھے کی طرف لائی ہے، اس پر ایسے عجیب و غریب قسم کے موڑ ہیں کہ اگر میں چاہوں بھی تو دن یا رات کسی وقت بھی انھیں دوبارہ ذہن میں نہیں لا سکتا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ بربادیاں، یہ خاموشی اور یہ اداسی مجھ پر کیوں اثر نہیں کر رہے ہیں۔ کیا دوسروں کے لئے بھی سفر اتنا ہی طویل ہوگا؟ کم از کم اتنا طویل! اگر ایسا ہوا تو اس مدت میں اس جگہ کا مالک میں ہوں گا۔ اب مجھے کسی گھر کی ضرورت نہیں کہ پناہ لوں، کسی آتشدان کی ضرورت نہیں کہ زندہ رہ سکوں۔ میں اس ہوا اور اس روشنی میں اس لئے نہیں رہتا ہوں کہ یہ مجھے گرم رکھیں گے اور نہ اس زمین کے پھل اس لئے کھاتا ہوں کہ زندہ رہوں۔ میں اس ہوا اور روشنی میں رہتا ہوں جو ہمیشہ روشن رہیں گی۔ سورج ہر شام کو غروب ہو جائے گا اور دوسرے دن طلوع ہوگا پھر غروب ہونے کے لئے لیکن میری نگہبانی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس تمام عرصے میں آنکھیں کھلی رکھوں گا۔ وہ لوگ اپنے گھروں کو اور میدانوں اور کھیتوں کو یاد رکھیں گے، وہ لوگ واپس آئیں گے اور میری نگہبانی بیکار جائے گی۔

مجھے کبھی ان پہاڑوں کی سرحدوں کو پار نہیں کیا تھا اور نہ ہی ان کی چوٹیوں کو، جو ہماری نظروں کے سامنے تھیں۔ لیکن جنگ شروع ہو گئی تب ہم نے ان پہاڑوں میں حرکت دیکھی۔ لڑائی کے اتنے بہت سے برسوں میں ہم صرف پندرہ دن شریک رہے۔ وہ پندرہ دن جو تلوار اور آگ کے دن تھے۔ اس میں آدمی اور جانور یا تو بہ گئے تھے یا منتشر ہو گئے

تھے۔ اور مکانات برباد ہو گئے تھے۔ خدا مردہ اور زندہ دونوں پر رحم کرے!

میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہر رات گاؤں کے نیچے کسانوں کی لاشیں لینے جایا کرتا تھا۔ ہم اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا بہتر سمجھتے تھے بہ نسبت اس کے کہ اپنے آدمیوں کو گدھوں کے حوالے کر دیں۔ ہمارے فوجی گو دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن موجود رہتے تھے اور جو کچھ ہو رہا تھا اس کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ اس وقت بھی لڑتے رہیں گے جب ہم جدا ہو جائیں گے۔ ایک بار میں نے اپنے لڑکے طیب کو منتظرین میں پایا۔ . . . اب ایک اور منظر ان لوگوں کا انتظار کر رہا ہے ان پہاڑوں کے انتشار کے بیچ . . . . گرتے ہوئے دروازوں کی آواز کے ساتھ یہ شروع ہوا تھا فوجی ہاتھوں میں رائفل لئے لوگوں کو ان کے گھروں سے باہر نکال رہے تھے، بہت مشکل سے دکھائی پڑ رہا تھا کیونکہ صبح شفق پر ایک سفید لکیر کی حد تک نمودار ہوئی تھی۔ میرا سالا حمید ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ باہر نکلے یا نہیں فوراً ہی گولی سے ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ پلک جھپکتے میں ہم نے اپنے کو، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کو اپنے بچے بغل میں لئے ہوئے وادی کے درمیان پایا۔ اور صبح کو مٹیالی روشنی میں ہم نے اپنے تیل اور لکڑی کے گوداموں کو جلتے، اپنے اوڑھنے بچھانے کے سامان کمبل وغیرہ کو راکھ میں تبدیل ہوتے اور اپنے جانوروں کو گولی کا نشانہ بنتے دیکھا۔ وہ گدھے، مرغیاں اور کتے جو بھاگ سکتے تھے خوف سے چیختے چلاتے ہوئے وادی کے کناروں پر منتشر ہو گئے اور دوسرے جانور اپنے خون میں لت پت پڑے ہوئے تھے۔

ہم پر بندوقیں تان کر چلنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ ہم سڑک پر ہو لئے۔ ہم میں سے کچھ کے جسم پر سوائے قمیص کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ زیادہ تر ننگے پیر تھے۔ ہمارا راہبر ابھی مشکل سے ہی وادی کے نیچے پہونچا ہوگا کہ دھماکوں نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ مجھے اپنے گھر کا خیال آیا۔

جب ہم گاؤں پہونچے اس وقت تک سورج گرم ہو چکا تھا۔ وہ لوگ ہمیں ٹھہرنے کے لئے ایک مقام پر لے گئے جہاں ہمیں ایک تہ خانے میں بند کر دیا گیا۔ یہ کمرہ ٹائل لگے ہوئے فرش اور کائی

لگی پرانی دیوار کی وجہ سے کوئی پرانا حمام لگ رہا تھا۔ ایک ایسا حمام جس میں نہ سادے پانی کا نل تھا، نہ گرم پانی کا۔ اس کا دروازہ دیواروں کے دبیز ہونے کی وجہ سے کھوسا گیا تھا۔ دروازوں کی گولائی وہ واحد جگہ تھی جہاں سے روشنی آسکتی تھی، وہ بھی آنکھوں کے دیدوں کی طرح تھیں جو کہ کسی تہہ خانے میں جھانک رہی ہوں۔

ابھی ہمیں یہاں قید ہوئے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ مجھے کچھ عجیب قسم کے خیالات کا احساس ہونے لگا۔ کیا ہم وہاں ہفتوں سے قید تھے؟ دیواریں کیسی تھیں جو بتدریج قریب چلی آرہی تھیں؟ اس نصف سیاہی میں کوئی پُر اسرار شے ضرور تھی۔ اس پر نظر رکھنا ضروری تھا۔ . . . میری رگوں کی ہر دھڑکن میں ایک نہ ختم ہونے والی گھنٹی سی بجتی تھی جو اس دنیا سے دوسری دنیا کو کوچ کرنے کے لئے تھی۔ میں نے موت کا خیال ذہن میں بسا لیا اور سوچنے لگا کہ اس وقت میں کیسا لگوں گا جب زمین میرے جسم کو اپنے میں سمو رہی ہوگی اور میں یہ بھول گیا کہ مجھے کسی چیز پر نظر رکھنا تھی۔

ابھی تک کوئی آواز بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے پر زور دیا کہ آنکھیں اٹھا کر دوسروں کو دیکھوں۔ معلوم نہیں تھکن کی وجہ سے یا خوف کی وجہ سے کوئی شخص بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ تب میں نے سمجھ لیا کہ یہ قید آخری قید ہوگی جو ہم اس دنیا میں دیکھیں گے۔ وہ لوگ جو ایک دن پہلے قریب کے پہاڑوں سے چوکی پر زبردست حملہ کرنے آئے تھے میرے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کی مدد کی تھی اور ان کے واپس جانے کا سامان کیا تھا۔ میں کسی بات کا افسوس نہیں کرتا۔ مجھے یہ بھی افسوس نہیں تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔

کئی گھنٹے بعد، میں نہیں جانتا کتنی دیر بعد دروازہ دھیرے دھیرے کھلا اور میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی دن تھا اور ہم اسی جگہ آئے تھے اور اُس دن جب دروازہ کھلا تو اس کے پیچھے وقت کا ایک بہت بڑا حصہ گذر چکا ہے۔

ایک شخص ہتھیاروں سے لیس اندر آیا جس کے پیچھے وہ افسر بھی تھا جس کی آنکھیں

سمندری سبز رنگ کی تھیں اور جس کے بارے میں ہم نے اکثر سنا تھا۔ اس کے ساتھ چار آدمی اور بھی تھے جن کے ہاتھوں میں بلم تھے۔ اپنے رہنماؤں کی طرح وہ بھی صرف چھوٹی نیکریں پہنے ہوئے تھے۔ وہ ہماری طرف بڑھے اور خاموشی سے کھڑے ہو گئے اور اس کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ اس وقت گارڈ دروازے کے دونوں طرف قطار بنا کر کھڑے تھے۔ وہ ہمیں گھور رہا تھا۔ بغیر ایک لفظ کہے اس نے اپنے اسسٹنٹ سے کچھ اشارہ کیا۔

وہ ہم پر دوڑ پڑے۔

کیا انسان بھی اس وحشیانہ انداز میں جھپٹ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس شیطانوں کے گروہ نے ہم سب پر ہر طرف سے حملہ کر دیا اور وہ کمرہ چیخوں، دعاؤں اور مدد کی آوازوں سے گونج گیا۔ بچے رونے لگے۔

دروازے پر کھڑے سپاہیوں نے ہمارا نشانہ باندھا۔

ایک لمبی خاموشی نے ہمارے قید خانہ کو جکڑ رکھا تھا، جو کبھی کبھی کسی کے رونے کی آواز سے ٹوٹ جاتی تھی۔

اس کے بعد ایک سپاٹ اور پتھر جیسی آواز نے کہا "تمہارے پاس بات کہنے کے لئے پانچ منٹ ہیں۔ سب نام، فوجی اڈے اور چوکیوں کی جگہ وغیرہ سب بتا دو۔ صرف پانچ منٹ! جو شخص یہ سب راز بتائے گا وہ اپنے خاندان کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا۔"

یہ پہلا آدمی تھا جو ہماری زبان میں بولا تھا۔ میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ اس کی ناک بڑی اور سیدھی تھی۔ اس کی دونوں بھنویں اس کے سپاٹ ماتھے کے نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کا جسم عورت کے جسم کی طرح گداز تھا۔ جہاں عام طور سے مردوں کے بال ہوتے ہیں وہاں اس کے چکنی لٹکتی ہوئی کھال تھی جو صاف نظر آ رہی تھی۔

کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر چلا گیا۔ دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ اس کے باہر آنگن ایک تہہ خانہ کی طرح لگ رہا تھا۔ سب کی آنکھیں

اسی تہ خانے کے دروازے جمی ہوئی تھیں ـــــ وہ آدمی اپنے ان ہی ساتھیوں کے ساتھ پھر داخل ہوا۔ اب پانچ منٹ ختم ہو چکے تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھے بغیر کچھ سوچتا رہا۔ لوگوں کے سینے دبی دبی سانسوں کے ساتھ آہ بھر رہے تھے۔ بوڑھے سلیمانی کے حلق سے خراٹے کی آواز نکل رہی تھی۔ وہ بلغم تھوکنا بھول گیا تھا۔ میں پہلے سے ہی گرمی محسوس کر رہا تھا۔ ہوا جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

چودہ سالہ رمضانی جو پہلی قطار میں بیٹھا تھا اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں پر رکھ لیا جو اس کے گھٹنوں پر رکھے تھے۔ وہ تھکن کی وجہ سے یا تو سو رہا تھا یا زبردست غنودگی کے عالم میں تھا۔ وہ افسر دو قدم میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اس کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ لڑکے نے آنکھیں کھولیں، جھپکائیں اور آخر کار مسکرا دیا۔ اس نے اپنے ہوش و حواس پر قابو اس وقت کھویا جب اسے یہ احساس ہوا کہ اسے کمرے کے وسط میں لایا جا رہا تھا اور ان لوگوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ اس نے اپنے کو آزاد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اس نے ہماری طرف دیکھا، شاید اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے۔

اچانک ایک چاقو اس کی قمیص اور پائجامے کو پھاڑتا ہوا نکل آیا۔ اپنی عریانی سے شرمندہ ہونے کی وجہ سے رمضانی ہماری طرف نہ دیکھ سکا۔ اب وہ اپنے کو آزاد کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا لیکن ان چاروں آدمیوں کو اسے باندھ دینے میں کوئی مشکل نہ ہوئی۔ یہ سب بہت عجلت میں ہوا تھا۔ اور اب اس کو باندھ کر لکڑی کے ایک تختے پر رکھ دیا گیا تھا۔ چاروں آدمی تیزی سے اس پر جھکے اور اپنے چاقو اس کے جسم میں پیوست کر دئے۔ لڑکا چیخا اور پھر خون کے فواروں کے ساتھ وہ اس وقت تک چیختا رہا جب تک اس کی آنکھیں خون سے پھیل کر اندھیرے میں کھو نہ گئیں۔

یہ جلاد سیدھے کھڑے رہے۔ وہ خونی انداز میں اپنے ہاتھ لٹکائے اس جوان لاش کو دیکھتے رہے۔ روشندان سے روشنی کی ایک کرن رمضانی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ

نامعوری کی خوشی کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ میں نے خوف زدہ آنکھیں گول روشن دان کی طرف اٹھا دیں۔
وہ سڑک جو مجھے واپس لائی ہے اتنی پر ایسے عجیب و غریب موڑ تھے کہ میں اگر چاہوں بھی تو
دن یا رات کے کسی حصے میں انھیں دوبارہ ذہن میں نہیں لا سکتا ہوں۔ پتھر، پانی، ہوا اور درخت
اپنے اَن دیکھے ہاتھوں سے (بلکہ گرد آلود خاموشی سے) میرے چہرے کو ڈھانپ رہے ہیں۔ لیکن
کوئی اور چیز بھی مجھے گھیر رہی ہے اور میں اس صبح کمرے میں کیا ڈھونڈھ رہا ہوں؟

دو دو جلادوں نے مل کر رمضانی کی لاش اٹھائی اور اسے آنگن میں اٹھا کر لے گئے۔
تختے کی درازوں سے گر گر کر زمین پر خون ہی خون پھیل گیا۔ پھر کچھ سپاہی کمرے میں داخل ہوئے۔
ان میں سے ایک نے زہرا نام کی عورت کے قریب سے گذرتے ہوئے وہ پن توڑ دی جس نے
اس کے گاؤن کو ایک دوسرے کپڑے کے ٹکڑے سے باندھ رکھا تھا۔ کچھ لوگوں نے عورت کی
طرف گھور کر دیکھا لیکن اتنے میں وہ افسر جو چلا گیا تھا کمرے میں واپس آگیا۔ اس نے ان آدمیوں سے
بغیر کسی جھجک کے میرے پڑوسی سعید کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً چالیس سال کا تھا۔ تھوڑی ہی
دیر بعد یہ کسان بھی اسی انداز میں مارا گیا جس طرح رمضانی کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کی چیخوں کی رفتار
اچانک ٹرید گئی تھی اور وہ اونچی سے اونچی ہوتی چلی گئی۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی سسکیوں میں تبدیل
ہو گئیں۔ ایسا لگا کہ اس عرصہ میں ایک صدی بیت گئی ہو۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ رو رہے تھے۔ اس کے
پیروں، کلائیوں، گردن اور ہونٹوں سے خون نکل رہا تھا۔ چوکیداروں نے ہمیں چپ کرانے کے لئے
ہماری طرف بندوقوں سے ایسا نشانہ باندھا جیسے وہ گولیوں کی بوچھار کر دیں گے۔ میں نے اپنے
آنسو روک لئے لیکن کچھ لوگ دھیرے دھیرے سسکتے رہے۔ روشنی کی وہ کرنیں جو رمضانی کے اوپر
پڑ رہی تھیں اب مقتولوں کی ننگی لاشوں پر پڑ رہی تھیں۔ یہ ان کے جسموں کو نہلا رہی تھیں، وہ جسم جو اُن
گہرے سایوں سے گھرے ہوئے تھے جو ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں
کو بند کرنا بہتر سمجھا تاکہ خود سے یہ سوال نہ پوچھ سکوں کہ ان لوگوں کو کس نے اُکسایا تھا۔

سعید آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے دعا کی کہ اس کی روح اسے واپس مل جائے۔

اب وہ آہستہ آہستہ سسک رہا تھا جب وہ دوسروں سے زیادہ تیز رونے کی کوشش کرتا تو اس کے ہونٹ لرزنے لگتے۔ اب اس کا سسکنا بند ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھولیں۔ اسی سپاٹ آواز نے دوبارہ کہا "تم لوگوں کے پاس صرف پانچ منٹ بات کرنے کے لئے ہیں۔"

عورتیں خوف زدہ ہو گئیں۔ دو نوجوان لڑکیاں جو میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں بے ہوش ہو گئیں۔ ایک فوجی لکڑی کی گاڑی لایا اور اسی پہ سعید کا جسم جو اب عریاں اور خون آلود تھا رکھ کر باہر لے گیا۔ لکڑی کے تختوں کے بیچ سے خون بہہ رہا تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں پر اور اس افسر پر جو ہمیں اپنی پیٹھ دکھا گیا تھا، چوکیداروں اور قید خانے کی دیواروں پہ ایک گہری نظر ڈالی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کسی چیز کی تلاش میں تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی احساس کے اس نقطۂ عروج پر پہونچ جاتا ہے کہ وہ اسرار پر سے پردہ اٹھائے اور اس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اس سے پیدا ہونے والے خوف کو دبا سکے۔ اگر موت اس کی آنکھیں بند کرنے آجائے تو یہ اُس کا کرم ہو۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہی احساس وہاں بھی اس وقت موجود تھا۔

فوجی افسر پیر پٹکتا ہوا کمرے میں آیا اور چلا گیا۔ وہ بار بار اپنے بازوؤں کو اپنے سر تک لے جاتا تھا پھر گرا دیتا تھا۔ ہم سب اتنا تھکے ہوئے تھے کہ ہماری سسکیاں اور مصنوعی جسم کر رہ گئے تھے۔ چوکیدار جو دروازے پر مستعدی کے ساتھ کھڑے تھے، پتھر کے بت دکھائی دے رہے تھے۔

اپنی اپنی حرکات بھول کر بچے اب صرف اس آدمی پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ایک کونے میں چھینکا۔ ایک عورت نے فوراً اسے روکا۔ بچے نے پھر مایوسانہ رویہ اختیار کیا اور اس کا چہرہ سوکھ گیا۔

افسر اپنی بھاری لمبی اور سیاہ آنکھیں ہم پر جمائے انتظار کرتا رہا۔ اس دفعہ بچی

کی باری تھی جسے وہ لوگ سزا دینے کے مقام پر گھسیٹ لے گئے۔ وہ ان بے شمار لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے لڑنے والے لوگوں کی ہمت بڑھائی تھی۔ جب وہ اسے ڈھکیل رہے تھے تو ایک بھورے رنگ کے بالوں والے لڑکے نے پکڑ لیا۔ لڑکے کو اتنے زور سے گھونسہ مارا گیا کہ وہ کئی قدم آگے جا کر گرا اور پھر نہیں ہلا۔ صادقہ نام کی ایک عورت پنجوں کے بل چل کر وہاں پہونچی اور اسے اپنے بازوؤں میں لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ یحیٰؔ کی چیخ و پکار کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انسانی خون کی محسوس اور زود اثر بو نے کمرے کے ماحول کو پراگندہ کر دیا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد یحییٰ کا جسم تقریباً بے جان ہو گیا تھا اور کافی دیر دیر کے بعد تڑپتا تھا۔ جیسے ہی اس کی سزا اختتام پر پہونچی اس نے ایک لمبی سی سسکی بھری۔ شاید اس کی روح ان آہوں کے درمیان میں سے اپنا راستہ ہموار کرنا چاہتی تھی۔

پھر وہ فوجی افسر جلاّدوں کو ایک طرف ہٹا کر اس پر جھک گیا۔ یحیٰؔ اب ساکت تھا۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی اس کی منزل پر جم چکی تھیں۔ پسینے میں شرابور جلادوں نے اپنی کہنیوں سے اپنے چہرے صاف کئے اور دلچسپی کے ساتھ مردہ اور زندہ آدمی کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگے۔

آفیسر ایک دم اٹھ کر باہر چلا گیا جیسے اس کے دماغ میں اچانک کوئی بات آ گئی ہو۔ سپاہی جلدی ہی کمرے میں ایک سخت جسم کی عورت کے ساتھ آئے جس کو دو فوجی پکڑے ہوئے تھے۔ یہ عورت الذب[illegible] تھی۔ بٹالین افسر کی بیوی جو چند روز قبل گرفتار کی گئی تھی۔ اس کا گاؤن گردن سے پیر تک پھٹا ہوا تھا اور اس کا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔

اور پھر اس کو بھی یحیٰ کے قریب ہی زمین پر پھینک دیا گیا۔

اسی لمحے دروازہ زبردست آواز کے ساتھ کھلا اور ایک اور افسر اندر داخل ہوا۔ وہ دونوں جسموں کو ایک دوسرے کے پاس پڑا دیکھ کر پیلا پڑ گیا۔ سپاٹ آواز میں اس نے جلاّدوں سے ایک طرف کھڑا ہونے کو کہا۔ وہ پہلے جھجکے پھر کچھ غصہ کے عالم میں

الگ جا کھڑے ہوئے۔ ان دونوں افسروں نے دھیرے سے کچھ بات کی۔ نووارد اس منظر کو دیکھ کر کانپا اور تیزی سے مڑا۔ بند مٹھیوں سے اس نے عورت کی طرف اشارہ کیا اور سپاہیوں سے اُسے ہٹانے کو کہا ـــ الدجے اسی کے سامنے باہر لے جائی گئی۔

دروازہ بند ہونے کے بعد ایک جلاد یحییٰ کی لاش کے پاس آیا اور اپنے چاقو کے ایک وار سے اس کا گلا کاٹ دیا۔ زمین پر خون کا ایک تالاب بن گیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے کی جانب ہٹ گیا۔

اس کے بعد جسے اس نے سزا کے لئے منتخب کیا وہ میں تھا۔ میرے چچا جو جنگِ عظیم میں زخمی ہو گئے تھے وہ آئے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا زخمی پاؤں دکھایا۔ دعا کرتے وقت ان کا چہرہ پتھر جیسا ہو گیا تھا۔ جب وہ مجھے سزا کی جگہ پر گھسیٹ کر لے جا رہے تھے تو عامرہ جو ایک جفا پرست شخص تھا وہ مردوں کے لئے پڑھی جانے والی دعا زور زور سے پڑھنے لگا۔ ایک گولی اس کے سر سے سنسناتی ہوئی گذری اور دیوار سے جا ٹکرائی ـــ وہ کانپا اور خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد کیا ہوا ـــ ایک کرب سے بھری ہوئی نیند جہاں پر میں ہوش کھو رہا تھا۔ نیند نے مجھے اپنے میں سمو لیا۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں ایک دوسری ہی بات سوچ رہا تھا۔ میں اس کو کس طرح بیان کروں۔ تکلیف وہ درد پر قابو پانے کی خواہش کی طاقت سے میں اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ وہ وقت جو تکلیف کا ہوتا ہے گذر جائے۔ اپنی آنکھوں کی جلن سے سوالات کر رہا تھا اور ان نقوش کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا جو ہل رہے تھے، کانپ رہے تھے۔ پہلے تو نقش کا ہر خط آدھا سمجھ میں آیا جس میں کہیں کہیں جگہیں خالی تھیں۔ دائرہ جیسی شکلیں، ایک مربع، پھر جلد ہی زیادہ صاف دکھائی دینے لگیں۔ میں نے اپنی ساری طاقت انھیں سمجھنے میں لگا دی، انھیں شروع کرنے کے لئے پہلے ان کے جوڑوں کا سمجھنا ضروری تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں کچھ الفاظ پڑھنے کے قابل ہو گیا۔ جہاں تک دوسرے

الفاظ کا سوال ہے میری مشکل پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ یا تو شاید میں نے ان الفاظ کو کناروں کی لائنوں سے ملحق کر دیا تھا یا شاید وہ کسی بھی زاویے سے پڑھے ہی نہیں جا سکتے تھے۔ میرے لئے یہ الفاظ مجھ سے بالاتر ہی رہے۔ کون جانے اتفاقی زاویوں سے زیادہ کچھ نہ رہے ہوں جو اکثر قدرت ہمیں مہیا کرتی رہتی ہے۔ میں نے انھیں کوئی قطعی شکل دینے کے لئے بے حد صبر سے کام لیا۔ میں نے ان میں سے ایک کو الگ کر لیا جیسا کہ پہلے لفظوں کے ساتھ کیا تھا، پھر دو کو اور الگ کیا لیکن جب میں نے سوچا کہ میں کامیاب ہو رہا ہوں تو میرا دماغ اتنا منہمک تھا کہ دوسرے الفاظ منتشر ہو گئے اور غائب ہو گئے۔ اس کے بعد مجھے ان کی بناوٹ بھی یاد نہیں رہی۔

پھر میں انھیں لفظ بہ لفظ پڑھنے کا ارادہ چھوڑ کر ان کی پوری شکل پر غور کرنے لگا کہ یہ الفاظ ایک دوسرے سے کس طرح جڑیں گے اور ان کا ان الفاظ سے کیا تعلق ہے جو میری آنکھوں کے سامنے پہلے کئی دفعہ گذر چکے ہیں۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ وہ صاف الفاظ کسی دشمنی کی وجہ سے بکھرنے لگے اور دوسری قسم کی صورتیں اختیار کرنے لگے۔ آخر کار وہ سب مل کر ایک لفظ بن گئے۔ حالانکہ میں تمام الفاظ نہیں جانتا تھا لیکن پھر بھی مجھے ایک دم یہ احساس ہوا کہ ان میں سے کچھ الفاظ کسی اور زبان سے ماخوذ تھے، جو اگر سمجھ میں آجاتے تو دوسرے تمام الفاظ کو بیکار بنا دیتے۔

اس کے بعد کیا ہوا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ میں ایک سہماں نواز سرزمین کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ وہ زمین جہاں مجھے ان تمام الفاظ کے معنی معلوم ہو سکتے تھے اور جو میرے لئے کار آمد بن سکتی تھی۔ اس انوکھی سڑک پر مجھ سے جتنی دور تک دیکھا جا سکتا تھا میں نے دیکھا۔ یہ سڑک صبح کی سرخ کرنوں سے منور تھی۔ دھیرے دھیرے مجھے اس پر اسرار راستے کا راز معلوم ہونے لگا اور میں نے اپنی یادداشت کی ایک جھلک دیکھی۔

بہت زمانہ گذرا میں نے ایک کھیل ایجاد کیا تھا۔ اس کھیل میں کچھ انجانے الفاظ

اپنے طور پر منتخب کئے ہوئے پتھروں، پتیوں اور لکڑی کے ٹکڑے اور ہڈیوں پر لکھ دیا کرتا تھا پھر میں ان کو بکھیر دیتا تھا اور یہ خیال کرتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک لفظ اسی آدمی کے لئے ہے جو اسے اٹھائے گا اور اسے محفوظ رکھے گا ایک مددگار تعویذ بن جائے گا ـــــــــ

ایک دن میں نے اپنی قوت اور ذہانت اور پچھلے "تعویذوں" کا صرف تجربہ کر کے سب سے زیادہ طاقتور فارمولا بنایا اور اسے بھی پچھلے تمام تعویذوں کی طرح قسمت پر چھوڑ دیا۔

یہ الفاظ اسی تعویذ کے تھے جو میری آنکھوں کے سامنے آج گھوم رہے تھے۔ اپنے ایک طویل اور پوشیدہ سفر کے بعد یہ کم و بیش اپنی بنیادی شکل میں اڑتے ہوئے یہاں تک آ گئے تھے اور میں نے ہی انھیں حاصل کیا تھا۔

میں نے اپنی آنکھیں اندر سے بند کر کے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کر دیا۔ بہت دیر تک اس تجربہ کا حل معلوم نہ ہو سکا اور جب میں نے تھوڑا بہت اس کا سراغ پا لیا تو مجھے کافی سکون ملا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یقین ہونے لگا۔ میں ان لوگوں کی خوشیوں اور دعاؤں میں شریک ہو گیا جو محفوظ ہیں۔ ایک مہربان قسمت میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں ایک زمانے میں بغیر اپنے بارے میں سوچے اپنے تعویذ خود بنایا کرتا تھا اور اب ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے خود اپنے کو ان تعویذوں میں سب سے زیادہ مناسب تعویذ سمجھا تھا مگر میں اس تجربے کے معنی بھول گیا تھا۔ جو خاص مشکل حل ہونے کو رہ گئی تھی وہ یہ تھی کہ یہ پتہ لگایا جائے کہ میری قسمت میں کیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے ذہن کو اسی مسئلہ پر لگایا۔ یہ زندگی کا قانون ہے کہ ہر چیز اپنے میں ایک زنجیروں کا سلسلہ رکھتی ہے جس کو آپ زمان و مکان دونوں طور پر حل نہ کر لیں، مقصد سمجھ میں آ نہیں سکتا۔ اسی طرح انسان بھی شکل اور نظام ہے۔ ایک ایسی تحریر جادو داں، نوادر رکھتی ہے۔ ایک لفظ جو کچھ وجود میں ہے اس سے مختلف نہیں ہے۔ میں بھی اسی طرح ان تحریروں سے بنایا گیا ہوں جو میں نے بچپن میں ہڈیوں اور پتھروں پر کندہ کئے تھے۔

اس خوابناکی کے عالم میں سرخ شفق میری زمین کی حفاظت کرتی ہے۔ اس لمحہ میں اس کی پھیلتی ہوئی روشنی میں میں غیر محفوظ کھڑا رہتا ہوں۔

اب مجھے حفاظت کے لئے کسی گھر کی ضرورت نہیں ہے، نہ کسی آتش دان کی کہ میں اپنے کو گرم رکھ سکوں، نہ کسی پھل کی کہ میں زندہ رہ سکوں۔ میں تو اس ہوا اور روشنی میں جیتا ہوں جو ہمیشہ کے لئے روشن ہیں۔

اب کون اس راستے پر چڑھے گا جو وادی کے نیچے سے اوپر کی طرف مڑتا ہے۔ کون اپنے گھر بار کی حفاظت کرے گا اور اس کی دیواروں کی مرمت کرے گا۔ اب کون آگ جلائے گا؟

اب کون اپنے کھیتوں اور میدانوں میں جائے گا اور چٹانی زمین سے ان کے لئے زرخیزی فراہم کرے گا اور جب رات آئے گی تو کون زمین کے فرش پر لیٹ کر اس قسم کا لطف محسوس کرے گا جتنا کہ وسیع سمندروں میں ہوتا ہے اور کون اس دوسری سرزمین کا تصور ذہن میں لا سکتا ہے جو گہرے اور خفتہ سیاہ درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور جس کے اوپر ایک سرخ شفق اپنا سایہ کئے ہوئے ہے۔

یہ سرخ سورج کسی قیمتی پتھر کی طرح اپنی کرنیں بکھراتا ہے اور ایک زیادہ وسیع روشنی ان اندھیرے پہاڑوں کے اوپر پھیل جاتی ہے۔

میں رکھوالی کرتا رہوں گا ـــــــــ

میں انتظار کروں گا ـــــــــ

(ترجمہ: جعفر عباس)

ایران　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　جمال میرصادقی

پہلوان

میرے اباجی نے ایک بڑا سا مکان خریدا تھا۔ ہمارا پہلا گھر خاصا چھوٹا تھا ہم سب صبح سے گھر کا سامان اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے تاکہ دوسرے دن نئے گھر میں چلے جائیں۔ میری اماں جان زور زور سے ہر ایک پر حکم چلا رہی تھیں اور اپنے پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا کر کھڑکیوں اور دروازوں سے پردے کھینچ کر اتار رہی تھیں۔ کبھی ماشاء اللہ کی مدد سے قالین اکٹھے کر رہی تھیں کبھی برتنوں کو صندوق میں بھر رہی تھیں۔ ان سب بوریوں، قالینوں اور صندوقوں کو ماشاء اللہ جلدی جلدی نیچے صحن میں جمع کر رہا تھا۔ میری اماں جان نے اپنی پادر ایک طرح کا برقع، کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر مٹی کی ہلکی سی تہہ جم کر پاؤڈر کا کام دے رہی تھی۔ اباجی ننگے پیر ننگے سر صحن میں ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ وہ اپنے تھل تھل کرتے جسم اور ٹھگنے قد کی وجہ سے ہانپ رہے تھے۔ ماشاء اللہ سے سامان لے کر وہ صحن میں رکھتے جاتے تھے۔ ماشاء اللہ، اماں جان اور اباجی کے درمیان فٹ بال کی طرح پھر رہا تھا۔ اس کا گول مٹول سرخ و سپید چہرہ، جو پہلے ہی ایک غبارہ کی طرح تھا اب اور بھی سرخ اور پھولا پھولا لگ رہا تھا۔ وہ سامان کو اوپر سے نیچے بھاگ بھاگ کر لا رہا تھا۔ اس کا سانس بے طرح پھول گیا تھا۔ جیسے ہی وہ کوئی چیز لے کر نیچے دوڑتا، اماں جان کی آواز اس کے پیچھے گونجتی۔

"ماشاءاللہ، میز کو صحن میں ایک کونے میں رکھ دو۔"

"ماشاءاللہ، ذرا باورچی خانے میں جھانک کے دیکھیو، دھواں تو نہیں پھیل رہا۔"

"ماشاءاللہ، ذرا دوڑ کے روٹی تو لے آ بازار سے۔"

اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے ابا جی دہاڑتے۔

"ماشاءاللہ، کہاں مر گیا کم بخت۔"

"ماشاءاللہ، جلدی آ، ذرا یہ صندوق اٹھا دے۔"

"ماشاءاللہ، ارے کھڑا کیوں ہے نابکار، ذرا جلدی سے۔ ۔ ۔"

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ گھر میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ میں بڑی چوکی کے پاس لیٹ گیا تھا جس کے نیچے انگیٹھی تھی۔ اس حرارت نے میرے برہنہ جسم کو اپنی نرم گرم آغوش میں لے لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں ماحول سے غافل ہو گیا۔ ایک لذت آور نیم غنودگی مجھ پہ طاری تھی۔ ماشاءاللہ کے سیڑھیاں چڑھنے اترنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے ٹھنڈے یخ ہاتھوں کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنے کے لئے زور سے 'ہا' کی آواز نکالتا تھا اور اسی طرح ہانپتا کانپتا ابھی تک صحن میں سامان جمع کر رہا تھا۔

ماشاءاللہ کو ہمارے گھر میں نوکر ہوئے ایک ماہ نہ گذرا تھا۔ وہ مجھ سے چند ہی سال بڑا تھا۔ میری اماں جان کہتی تھیں کہ وہ پندرہ سولہ سال سے زیادہ کا نہ تھا لیکن وہ اپنے سڈول جسم اور لمبے قد کی وجہ سے میری نظروں میں پورا مرد تھا۔ میں جب کبھی اپنا مقابلہ اس سے کرتا تو آئندہ دس پندرہ سالوں میں مجھے اس جیسا قوی ہیکل بننے کی کوئی امید نظر نہ آتی۔ اس کا چہرہ چوڑا چکلا اور بے حد شاداب ایک تھالی کی طرح گول اور چمکیلا تھا۔ وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ ہم لوگ اگر ذرا اس کے کام کی تعریف کر دیتے یا وہ کوئی مشکل کام انجام دے لیتا تو ایک معصوم سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی۔

جن دنوں وہ بالکل نیا نیا ہمارے گھر آیا تھا اماں جان اس کے اجڈپن اور حماقت

سے عاجز آکر اکثر اباجی سے لڑنے لگتی تھیں۔ "میں کہتی ہوں یہ تم کسی طویلے سے جا کر پکڑ لائے اسے۔ کم بخت بیل ہے بیل، کام کا نہ کاج کا سیر بھر اناج کا ـــ نامراد کو کوئی کام بھی تو نہیں آتا۔ اے ہاں بے تنخواہ کے نوکر ایسے ہی ہوں گے اللہ مارے ـــ"

اباجی کہتے تھے۔ "اب زیادہ مت اجی جلاؤ۔ آہستہ آہستہ سب سیکھ جائے گا۔ ابھی تک بے چارے کو کسی نے کچھ سکھایا ہی نہیں۔ جو کچھ بھی سیکھا ہے اس نے اپنے شوق سے خود سیکھا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تھوڑے ہی دنوں میں تم اس کی یوں محتاج ہو کر رہ جاؤ گی کہ ہل کر پانی بھی نہ پیو گی۔ اور بھئی، سچ پوچھو تو یہ اس کا سیدھا پن تو سب سے بڑا سرٹیفکیٹ ہے۔ کیا تم چاہتی تھیں میں کسی ایسے لڑکے کو لے آتا جو آتے ہی اس گھر کا صفایا کر دیتا۔ پھر تم ہی سر پکڑ کر روتیں ـــ" وغیرہ وغیرہ۔

ویسے میں جانتا تھا کہ اباجی صرف اماں جان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے ایسی باتیں بناتے ہیں ورنہ وہ خود ماشاء اللہ کے زیادہ کھانے سے عاجز تھے۔

ماشاء اللہ ایک وقت میں دو آدمیوں کا کھانا کھا جاتا تھا۔ شروع شروع میں جب آیا ہے تو کھاتے ہوئے اتنے زور زور سے منہ چلاتا اور آوازیں نکالتا تھا کہ ہنستے ہنستے ہم سب کے پیٹوں میں بل پڑ جاتے۔ اماں جان کہتیں: "جوانا مرگ، قحط کا مارا ہے۔ ناس پیٹے، آہستہ کھا۔ کوئی تیرے آگے سے کھانا لے کر نہیں بھاگتا۔"

اس کے آگے جو بھی رکھ دیتے بے صبری سے نگل لیتا۔ اس کے بعد رکابی کو بلی کی طرح چاٹ کر صاف کر دیتا اور پھر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دستر خوان سے اٹھ جاتا ـــ آہستہ آہستہ چند ہی دنوں میں اس نے سب کے دل میں گھر کر لیا۔

ماشاء اللہ گھر کا سارا کام کرتا تھا۔ برتن مانجھتا، جھاڑو دیتا، باغ میں پانی دیتا، گل دانوں میں پھول سجاتا، کپڑے دھوتا، باغ اور تر کاریوں کی دیکھ بھال اس کا من بھاتا کام تھا۔ وہ کوشش کرتا کہ زیادہ سے زیادہ وقت باغ میں گزارے۔ دن میں دسیوں

پھیرے بازار سودا سلف لانے کے لئے کرنا۔ دوپہر کو اباجی کا کھانا کارخانے پہنچانا اور پھر دکان سے صندوق اٹھا کر گھر لانا یہ سب اس کے فرائض میں داخل تھا۔

میرے اباجی کا صندوق اور سوٹ کیس بنانے کا کارخانہ تھا۔ کارخانہ میں جگہ کم تھی اس لئے زیادہ قیمتی اور خوب صورت صندوق اور سوٹ کیس وہ گھر بھجوا دیتے تھے اور جب کوئی مناسب خریدار مل جاتا تو گھر سے منگوا لیتے تھے ورنہ عید کے موقع پر عموماً تمام صندوق وغیرہ مہنگے داموں بک جایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ہمارے گھر میں دس پندرہ سوٹ کیس اعلیٰ چمڑے کے، جن پر خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور جن میں اخروٹ کی لکڑی لگائی گئی تھی، موجود تھے۔ اس کے علاوہ کتنے ہی صندوق تھے۔ اباجی کی نظر جب بھی ان پر پڑتی تھی خوش ہو کر کہتے تھے۔

"اب کی عید پر سب بک جائیں گے انشاء اللہ، سچ پوچھو تو یہ خود بڑی بھاری دولت ہے۔"

جس وقت سے ماشاء اللہ ہمارے گھر آیا تھا میرے لئے ڈھال کا کام دیتا تھا۔ اگر کوئی غلطی مجھ سے ہو جاتی تو میں فوراً اس کے سر منڈھ دیتا۔ ماشاء اللہ پر میری بجائے اکثر مار پڑتی مگر وہ اُف نہ کرتا۔ میں جو چاہتا اس سے کروا لیتا۔ کبھی اسے گھوڑا بنا کر رسی اس کی گردن میں ڈال کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا، پھر اسے زور زور سے رسی سے مارتا یا پاؤں اس کی پسلی میں اڑا دیتا اور خوب سواری کرتا۔ وہ ہمیشہ میرا حکم مانتا اور برابر ہنستا رہتا۔

ایک مہینہ پہلے جب ہم سکینہ پھوپھی کے گاؤں گئے تھے تو واپسی میں ماشاء اللہ کو اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ مجھے یاد ہے اباجی نے اس کے بوڑھے بیمار باپ سے کہا تھا۔

"تم فکر نہ کرو میں ایک دو سال اسے خود کام سکھاؤں گا۔ جب ذرا چل نکلے گا تو اسے اپنے ساتھ دکان پر بٹھاؤں گا۔ اس نے اگر محنت اور قابلیت سے کام کیا

اور تجارت کے گر سمجھ لئے تو چوک میں اپنے سرمایہ سے ایک دکان اسے کھول دوں گا۔ تاکہ یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور ایک دن بڑا آدمی بن جائے۔"

بڑے میاں احمقوں کی طرح منہ پھاڑے اباجی کے منہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ اباجی کے منہ کی حرکت کے ساتھ ان کا سر اوپر نیچے ہل رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان کا سر اباجی کے باہر نکلے ہوئے دانتوں سے جا ٹکرایا ہو اور وہیں چپک کر رہ گیا ہو۔ وہ بار بار بس یہی کہے جاتے تھے۔

"ماشاء اللہ آپ کا غلام ہے۔ آپ کا نوکر ہے۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ اللہ آپ کے بچوں کو ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ آپ کا رتبہ بلند ہو۔ آپ اس کے لئے جو بھی کریں گے بہتر کریں گے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ خدا کرے یہ آپ کے زیر سایہ کچھ بن جائے۔ جیسے شہدی جعفر عطار کا لڑکا۔ جس نے شہر میں اب اپنا مکان بنا لیا ہے اور اب اپنے رشتہ داروں کو بھی نہیں پہچانتا۔ خدا نے چاہا تو ماشاء اللہ کا مقدر بھی چمکے گا۔"

ماشاء اللہ کی ماں بچے کو دودھ پلاتی جاتی تھی اور اپنی موٹی موٹی اداس آنکھوں سے ہم سب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ میرے اباجی نے کہا "بھئی تم تو جانتے ہی ہو آج کل پیسہ کمانا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ کس کے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ ایک جان کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اب ماشاء اللہ کو کھانے کو بھی چاہیئے، کپڑا جوتا بھی چاہیے، دھوبی ہے، نائی ہے، حمام ہے۔ تم خود سوچو یہ کچھ کم خرچ تو نہیں ہے۔ میں تو صرف ثواب سمجھ کر اور اس لئے کہ تم لوگوں کی بھی کچھ مدد ہو جائے اسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ سال میں کچھ نہ کچھ تم لوگوں کے لئے بھیج دوں گا۔ کبھی گھی کا کنستر، کبھی چاول، کبھی بچوں کے لئے جوتے۔ اس موقع پر اباجی نے ماشاء اللہ کے نصف درجن بھائی بہنوں کی طرف اشارہ کیا جو ننگے پاؤں صحن میں بھاگتے پھر رہے تھے، اس کے بعد جب

ماشاء اللہ کام سے لگ جائے گا تو اس کا روپیہ میں خود جمع کروں گا اور بعد میں اس سے دکان کھلوا دوں گا۔ اچھا تو اب چلیں، کوئی بات تو باقی نہیں ــــ بھئی تمہارا بیٹا کچھ ہی سال میں صاحبِ حیثیت ہو جائے گا اور کیا چاہتے ہو؟"

بڑے میاں کی آنکھیں چمکنے لگیں اور بولے۔ "اگر یہ بات ہے کہ چند سال بعد ماشاء اللہ بڑا آدمی بن جائے گا تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے جی۔ مگر حاجی جی، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ زمانہ بڑا سخت ہے۔ مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے۔ ماشاء اللہ اگر یہاں رہے تو تھوڑی بہت مدد تو اس سے ملے گی نا جی۔ حاجی جی، آپ نہیں جانتے ماشاء اللہ کتنا محنتی اور فرمانبردار ہے۔ اسے کسی کام سے عذر نہیں۔ اور حاجی جی، ہمارے مکان کی چھت ٹپکنے لگی ہے، اس کی مرمت کے لئے کچھ نہ پیسہ چاہئے ہی۔ مگر میرے پاس پیسہ کہاں؟ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ ہمارے تن پہ چیتھڑے لگے ہیں۔"
اس کے بعد کافی دیر تک ابا جی اور بڑے میاں کھسر پھسر باتیں کرتے رہے۔ پھر ابا بولے۔ "اچھا، اچھا اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ پھر ابا جی کا ہاتھ جیب میں گیا، باہر بٹوے کے ساتھ نکلا اور پھر ہم باہر آئے۔ جب ابا ماشاء اللہ کو ساتھ لے کر چلنے لگے تو اس کی ماں رونے لگی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "حاجی جی، میں نے اپنے بچے کو خدا اور آپ کو سونپا۔ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کیجئے، اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ دیکھئے، اگر پہلے پہل ٹھیک کام نہ کرے تو اسے زیادہ مت برا بھلا کہئے گا، بے حد شریف بچہ ہے، آہستہ آہستہ سیکھ جائے گا۔" ابا جی نے کہا۔ "تو کسی طرح کا فکر نہ کر بی بی، تیرے بچے کو نہایت آرام سے رکھوں گا۔ بڑے آدمیوں میں اٹھے بیٹھے گا تو ایک دن خود بھی بڑا آدمی بن جائے گا۔ اور تو کیا چاہتی ہے۔"

ہم ان کی جھونپڑی سے کچھ دور نکل آئے تو وہ دوڑی دوڑی آئی اور روتے ہوئے بولی۔ حاجی جی خدا آپ کا بھلا کرے تھوڑے دن بعد اسے ضرور کسی آتے جاتے

کے ساتھ بھیج دیجئے۔ اس نے آج تک گھر سے باہر پاؤں نہیں نکالا ہے، نئی جگہ گھبرائے گا۔"
ابا جی نے اسے اطمینان دلایا اور ہم دوبارہ چل پڑے۔ ماشاء اللہ کی ماں بچے کو گود میں لئے بیچ سڑک پر آئی اور دور تک ہمیں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ اس کے چاروں طرف پانچ چھ بچے جمع تھے۔ ان میں سب سے بڑا لڑکا میرے برابر تھا۔ ماشاء اللہ مڑ مڑ کر پریشان نگاہوں سے انھیں دیکھتا جاتا تھا۔ اس کی ماں اسی طرح سڑک کے درمیان کھڑی تھی اور رک رک کر چادر سے آنکھیں پونچھتی جاتی تھی۔ اس نے بچے کو زور سے اپنے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ دوسرے بچے اس کی چادر کو پکڑے حیران اور مبہوت ہمیں جاتا دیکھ رہے تھے۔

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جاتا تھا۔ ماشاء اللہ کے چلنے پھرنے کی آواز ابھی تک دروازے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ساری رات اسی طرح اوپر نیچے کے چکر لگاتا رہا ہے۔ ابا جی ایک ریڑھی لے کر دروازے پر آگئے تھے۔ ایک ٹھگنے سے قد کا مریل بوڑھا چابک لئے گاڑی پر بیٹھا تھا۔ گھوڑا کوچوان سے بھی دو قدم آگے تھا۔ اس کی تمام پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ اب گرا اب گرا۔ بے حد کمزور اور مریل سا۔ کوچوان اونچی آواز سے کرایے پر جھگڑ رہا تھا۔ میں نے سنا:
"آخر حاجی جی دنیا میں انصاف بھی کوئی چیز ہے۔ یہ دس پھیروں کا کرایہ دے رہے ہیں آپ؟ اور پھر سامان لادنے کی میری مزدوری کہاں ہے؟"
ابا جی غرا کر بولے: "جو کچھ ہے یہی ہے، اس سے زیادہ میرے پاس ایک کوڑی نہیں ہے، لینا ہے تو لو ورنہ کسی نے تمہارا راستہ نہیں روکا۔"
بڑے میاں بولے: "حاجی جی، اگر دو چار پیسے مجھ غریب کو مل جائیں گے تو سات آٹھ جانیں آپ کے جان و مال کو دعائیں دیں گی۔"

ابا جی ایک دم بپھر گئے "یعنی میں کہتا ہوں تم کیا چاہتے ہو۔ اپنے تن کے کپڑے اتار کے تمہیں دے دوں۔ یہ کرایہ کم ہے کیا۔ جب میرے پاس اس سے زیادہ ہے ہی نہیں تو تمہیں کہاں سے دوں؟" کوچوان نے تیوریاں چڑھائیں، گھوڑے کو چابک لگایا اور ریڑھی چل پڑی۔ لیکن گلی کے نکڑ تک پہنچ کر وہ پھر واپس لوٹ آیا اور بے دلی سے سامان لے جانے پر تیار ہو گیا۔ ماشاء اللہ کی مدد سے ابا جی نے سامان ریڑھی پر لادا اور اسے ساتھ لے کر نئے گھر چلے گئے۔ اسی طرح کئی پھیروں میں سب سامان نئے گھر پہنچ گیا۔ کوچوان برابر بڑبڑاتا جاتا تھا اور حاجیوں کو برا بھلا کہتا جاتا تھا۔ آخری پھیرے میں ابا جی سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ ابا جی چاہتے تھے کہ جو پلیٹیں اس کی ریڑھی میں ٹوٹی ہیں ان کی قیمت کرایہ میں سے کاٹ لیں۔ کوچوان نے چیخ چیخ کر سارے محلے کو اکٹھا کر لیا تھا۔ اگر اماں جان بیچ بچاؤ نہ کرتیں تو ضرور مار پیٹ تک نوبت آ جاتی۔ انھوں نے اپنے پاس سے باقی پیسے دے کر کوچوان کو رخصت کیا اور اس طرح یہ جھگڑا ختم ہوا۔

اس دن بے حد سردی تھی۔ ہر طرف کہر چھائی تھی۔ پتیوں سے ننگے درخت، اینٹوں کی دیواریں اور کچی زمین سب پر برف کی تہہ جمی تھی۔ جہاں بھی پاؤں ڈالو پھسل پڑتا تھا۔ سردی کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے تھے۔ ہم سب انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئے اور وہیں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اماں جان بولیں "اے میں نے کہا، ماشاء اللہ سے اکیلے تو اتنا سامان نہیں اٹھے گا۔ غریب تھک کے چورا ہو گیا ہے۔ کسی مزدور کو بلا لو کہ اس کے ساتھ لگ جائے۔" ابا جی بھنا کے بولے "میں دس بارہ روپے کس کے گھر سے لاؤں جو اسے دوں گا۔ روپیہ کیا درختوں پہ لگا ہے کہ ہاتھ بڑھا کر توڑ لو یا میرے گھر میں سونے کی گنگا بہہ رہی ہے۔ اسے کام کی عادت پڑنے دو۔ اور پھر ہم لوگ بھی تو اس کی مدد کو ہیں۔"

اماں جان تنک کر بولیں "آخر کنجوسی کی کوئی حد بھی ہے، میں تو تم سے تنگ آ گئی ہوں۔ گھر کے خرچ میں سے تم ہاتھ اٹھاؤ، میرے ہاتھ خرچ میں تم ڈنڈی مارو، جعفر کے پھٹے کپڑوں میں سے تم بچاؤ، پھر بھی میں کچھ نہیں کہتی مگر تم ہو کہ ___ آخر اس دولت کا کیا ہوگا۔ پتہ نہیں اس معصوم بچے سے کیا گناہ ہوا تھا کہ تم جیسے ظالم وحشی کے ہاتھ لگ گیا۔ غریب بیلا پڑ گیا ہے، اگر خدا نخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو خدا کو کیا جواب دو گے۔ یہ بھاری بھاری پونڈ جیسے صندوق.."

"کمینی، اب چپ ہوتی ہے یا لگاؤں دو ہاتھ۔" اباجی زور سے ہاتھ مار کر چیخے۔

"تو نے سمجھا کیا ہے، ہمیں معلوم ہے ہمیں کون سا کام کرنا ہے کون سا نہیں۔ میں تیری بیوی نہیں ہوں کہ تیرے حکم پر چلوں۔" اماں جان ہمیشہ کی مانند خاموش ہو گئیں۔ وہ اباجی کو ناراض کرنے سے بے حد ڈرتی تھیں اور اگر کبھی کسی بات پر زیادہ اصرار کرتی تھیں تو اباجی انھیں دھن کر رکھ دیتے تھے۔ اباجی نے جیب سے تسبیح نکال لی اور اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔

جس وقت ماشاءاللہ صحن میں سے گزرا تو اباجی نے اسے بڑے پیار اور پدرانہ شفقت سے پکارا "پہلوان کھانا کھا لیا۔ مزے میں تو ہے۔"

ماشاءاللہ اباجی کے اس طرح اپنائیت اور پہلوان کہہ کر بلانے سے کھل اٹھا۔ اس نے زور سے سر کو ہلایا۔ اباجی نے اس کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "پہلوان ہے پہلوان۔ پورا پہلوان ___ ہاں تو آؤ ماشاءاللہ پہلوان، یہ کام اب ختم کر ہی ڈالیں ___"

ماشاءاللہ ہنسا، سر ہلایا اور اباجی کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ اماں جان نے پیچھے سے پکار کر کہا "جب تھک جاؤ تو آ کر چائے کی پیالی پی لینا۔" اور آہستہ سے ماشاءاللہ سے کہا۔ "اپنی جان زیادہ مت ہلکان کیجیو۔" ماشاءاللہ نے اپنے چپل اتار دیے اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ ہم سب جوش و خروش سے سامان اٹھانے میں لگ گئے۔

اماں جان کمرے میں تھیں۔ ان کا کام چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھنا تھا۔ مجھ سے

جو کچھ بن پڑتا تھا اٹھا اٹھا کر کمرے میں لے جاتا تھا۔ اباجی میری ہمت بڑھاتے تھے۔ ”شاباش بھئی شاباش، تو تو اب پورا جوان ہو گیا جعفر بیٹے۔ ذرا دیکھو کیسے ہمارے برابر کام کر رہا ہے۔ شاباش بیٹے شاباش۔“

بھاری کام اباجی اور ماشاءاللہ مل کر کر رہے تھے۔ اباجی نے سر پہ صافہ باندھ رکھا تھا اور اونی لبادہ پہنے ہوئے ننگے پاؤں ہانپ ہانپ کر سامان اٹھا رہے تھے۔ ذرا سی دیر ہی میں وہ تھک کر صحن میں ایک صندوق پہ دیوار کے سہارے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد سارا کام اکیلے ماشاءاللہ کے کندھوں پر پڑ گیا۔ اس کا چہرہ سردی کے مارے نیلا ہو گیا تھا۔ کالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اپنے ہاتھوں کو وہ منہ کی بھاپ سے گرم کرتا اور پھر ایک ہی سانس میں سامان لے کر اوپر چڑھ جاتا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اباجی کی پوری کوشش کے باوجود گھر کا آدھا سامان، ان کے سارے صندوق، آئس بکس اور سوٹ کیس صحن میں بکھرے پڑے تھے۔ جب صندوق اٹھانے کی باری آئی تو اماں جان نے کہا۔ ”اب ذرا سی چائے پی کر تھکن اتار لو اور پھر یہ صندوق اکیلے ماشاءاللہ کے بس کے نہیں ہیں۔ دوسرا آدمی ضروری ہے۔“ اباجی آنکھیں نکالتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ ”دوسرا آدمی کیوں ضروری ہے“ تو پھر بولی، ”پھر مجھ پہ حکم چلانے چلی، ہیں! بتاؤں ابھی۔ یہ سارے صندوق ابھی برآمدے میں رکھے جائیں گے ورنہ باہر بارش اور برف میں پڑے پڑے زنگ لگ گیا تو یہ کہیں کا نہ رہوں گا۔ چائے کی ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔“ جس صندوق میں گھر کے تمام برتن بھرے تھے اور جسے اباجی نے کوچوان اور ماشاءاللہ کے ساتھ مل کر بڑی مشکل سے اٹھایا تھا اباجی اس کی طرف بڑھے اور ماشاءاللہ کو آواز دی۔ ”ہاں تو میاں پہلوان، آنا ذرا ادھر۔۔۔“ ماشاءاللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ دیوار کے سہارے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تھکن کے مارے برا حال تھا اس کا۔ اباجی نے ہاتھ مل کر کہا۔ ”پہلوان کہیں تھک تو نہیں گئے“، ”نہیں بھئی کہیں پہلوان بھی تھکا کرتے ہیں، نہیں تھکتے نا

ماشاءاللہ پہلوان۔"

ماشاءاللہ نے سر اٹھایا، زور سے ہنسا اور زبردستی اپنے جسم کو سیدھا کیا۔ لڑکھڑاتا ہوا آگے آیا۔ اماں نے پھر کہا "کم سے کم اسے چار تو پی لینے دو۔"

اباجی نے بیچ میں ہی بات کاٹ کر کہا "جب ماشاءاللہ پہلوان موجود ہے تو پھر کیا فکر — ہاں میاں ذرا دکھاؤ تو اپنی بانگی، میں بھی تمہاری مدد کو موجود ہوں — پیچھے سے میں پکڑتا ہوں۔"

اماں جان بولیں "جعفر کے ابا، ان صندوقوں کو رہنے دو۔ اس بچے کے بس کا کام نہیں ہے انھیں اوپر چڑھانا۔ کم بخت پہاڑ کی طرح بھاری ہیں۔"

اباجی نے پھر انھیں گھور کر دیکھا۔ اماں نے آنکھیں جھکا لیں اور بےبسی سے ہاتھ ملنے لگیں۔ ماشاءاللہ نے کمر جھکائی اور اباجی نے اماں جان کے ساتھ مل کر بڑی مشکل سے صندوق اس کی کمر پہ لاد دیا۔

اس صندوق کے نیچے وہ ایک حقیر چیونٹی کی طرح لگ رہا تھا۔ اباجی نے ایک مسرور نظر ڈالی اور بولے "ہاں تو چلو میاں پہلوان۔"

ماشاءاللہ صندوق کے نیچے ذرا کسمسایا۔ اس کے پاؤں کانپنے لگے۔ اباجی نے صندوق پر سے اپنے ہاتھ اٹھائے اور اماں کی طرف فتحمندانہ نظروں سے دیکھ کر بولے۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا پورا پہلوان ہے پہلوان۔"

ماشاءاللہ ہنسا اور ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بوجھ کے مارے نکلی پڑتی تھیں۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر دوسرا قدم —

اباجی خوش ہو کے چلائے "ہاں میاں، چلے چلو اسی . . . ."

ماشاءاللہ چند قدم اور آگے چلا۔ اس کی گردن کی رگیں تن گئیں۔ ماتھے پر کئی لکیریں ابھر آئیں۔ اس کا منہ پورا کھلا تھا۔ اباجی پھر خوشی سے بولے "شاباش پہلوان۔"

ماشاءاللہ دم بھر کو کھڑا ہو گیا تھا، مسکرایا اور دوبارہ زور لگا کر چل پڑا لیکن ابھی دو چار قدم ہی چلا تھا کہ ایک دم تڑاق سے آواز آئی جیسے کوئی لکڑی کا تختہ چٹخا۔ اس کے ساتھ ہی ماشاءاللہ کی ٹانگیں وزنی صندوق کے نیچے مڑ گئیں۔ اس کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی "ہائے . . . ." اور صندوق کو لئے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے دانے ابھر آئے، سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ اماں جان اس کی طرف "کیا ہوا ماشاءاللہ کیا ہوا" کہتی ہوئی لپکیں۔ ماشاءاللہ نے درد سے بے قرار ہو کر کہا۔ "میری کمر . . ." اس کی آنکھیں تکلیف کے مارے ابل پڑیں۔ اباجی ناراض ہو کر بولے۔

"کھڑا ہو، کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا، ذرا سا چل پھر کے دیکھ۔ پہلوانوں کو کچھ نہیں ہوتا۔"

ماشاءاللہ جو ابھی تک صندوق کے نیچے تھا اور تکلیف کے مارے اس سے سانس تک نہیں لیا جا رہا تھا مسکرایا اور بڑی مشکل سے بولا۔ "ہاں مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔"

اماں نے کہا۔ "صندوق کو اس کی کمر سے اتار لو۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ ایک بچہ کا کام نہیں ہے۔" ماشاءاللہ نے دکھ سے اماں جی کی طرف دیکھا اور پھر اباجی کی طرف۔ جیسے اسے توقع تھی کہ وہ ابھی کہیں گے۔ "پہلوان ہے پورا پہلوان۔" لیکن اباجی نے میری اماں جان کو دھکا دے کر کمرے میں دھکیل دیا اور بولے۔ "دفع ہو، اپنا کام کر، مجھے دیکھنے دے کہ بات کیا ہے؟" اس کے بعد ہاتھ ملتے ہوئے چڑچڑے پن سے بولے۔ "ہاں بھئی ذرا کھڑے ہو کے تو دیکھ، یہ تو کچھ بات نہ ہوئی۔" ماشاءاللہ ذرا سا ہلا اور پوری طاقت لگا کر کوشش کی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو۔ اس کی ٹانگیں ذرا سی زمین سے اوپر اٹھیں، پسینے کے موٹے موٹے قطرے

چہرے سے پھوٹ نکلے۔ گردن کی رگیں کیڑے مکوڑوں کی طرح پھڑکنے لگیں۔ اس کا چہرہ بے حد وحشتناک اور عجیب سا ہو گیا۔ میں نے اس سے پہلے کسی کو ایسے نہ دیکھا تھا۔ ابھی وہ اپنے پاؤں پر اچھی طرح کھڑا نہ ہونے پایا تھا کہ اس کا جسم زور سے کانپا اور اس کی کمر تڑاق سے کھنچی اور وہ "ہائے اماں جی، ہائے" کہہ کر صندوق کے ساتھ ہی زمین پر ایک طرف لڑھک گیا۔

○

اندھیرا پھیل چکا تھا اور برف باری شروع ہو گئی تھی۔ ہم سب انگیٹھی کے پاس خاموش بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی کمرے کی خاموش فضا میں ماشاءاللہ کی کراہیں گونج اٹھتی تھیں۔ اسے خوب تیز بخار تھا اور وہ ہذیان بک رہا تھا۔ اماں جان تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے پاس جاتیں۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتیں اور غمزدہ سی اس کے پاس بیٹھ جاتیں۔ لحاف کو اچھی طرح اس کے گرد لپیٹ کر اس کا پسینہ پونچھتیں اور ایک ایک گھونٹ کر کے اس کے حلق میں گرم شربت اُتار رہی تھیں۔ ایک مرتبہ جب وہ انگیٹھی کے پاس واپس آئیں تو بولیں "حاجی جی، خدا نہ کرے اسے کچھ ہو نہ جائے، بدن تنور کی طرح دہک رہا ہے۔ بہتر ہے کسی ڈاکٹر کو بلا لیں۔ ہم جب یہاں آ رہے تھے تو گلی کے نکڑ پر ایک ڈاکٹر کا بورڈ دیکھا تھا۔۔۔"

میرے ابا کا غصہ کے مارے برا حال تھا۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر باندھے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ جھنجھلا کے بولے "ڈاکٹر، اب ڈاکٹر کی فیس بھی نواب زادے کے لئے، ڈاکٹر آخر کیا کرے گا اسے۔ ذرا سا تھک گیا ہے، سوئے گا تو صبح تک آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے۔۔"

اماں بے بسی سے بولیں۔ "اگر خدا نہ کرے اسے کچھ ہو گیا تو تم خدا کے ہاں کیا جواب دو گے؟ دیکھتے نہیں ہو اس کے چہرے پر کیسی مردنی چھا گئی ہے۔ ہائے ہائے رنگ

تڑپ رہا ہے، تمہیں ذرا رحم نہیں آتا۔"

ابا جی چیخے "اب بس کر، ٹر ٹر کئے جاتی ہے، دفعان ہو یہاں سے۔ یہ سارا تیرا کیا دھرا ہے۔ نہ کوچوان کو پیسے نکال کے دیتی نہ وہ جاتا۔ لیجئے صاحب اب ڈاکٹر کو بلواؤں، اسے فیس دوں، میرے پاس کیا قارون کا خزانہ دھرا ہے کہ لٹاتا پھروں۔ تو سمجھتی کیا ہے۔ اس گھر کا خرچ کیا کم ہے، کیا خیال ہے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا لے لوں۔ بخار ہو گیا۔ ہو جائے بخار صبح تک آپ ہی اُتر جائے گا۔ میرے سر پر کیوں سوار ہو رہی ہے۔" میں اماں جان کے ساتھ انگیٹھی کے پاس بیٹھا تھا اور ماشاء اللہ کے چوڑے چکلے بدن کو دیکھ دیکھ کر اس کے بوڑھے بیمار باپ کو یاد کر رہا تھا اس کی ماں پانچ چھ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچوں کے ساتھ میرے سامنے تھی جس نے ایک بچے کو سینے سے چمٹا رکھا تھا اور جو سڑک کے بیچوں بیچ چادر سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ جس کا دوسرا بڑا بچہ میرے جتنا تھا۔ ابا جی کے بڑبڑانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"آخر کار سامان باہر ہی پڑا رہا۔ ایک ایک صندوق ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے کا ناس ہو گیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ایسا نکلے گا ورنہ میں کوئی پاگل تھا کہ گاؤں سے لے کر یہاں آتا۔ لیجئے صاحب! اب ان کا خیال بھی رکھوں، ڈاکٹر کو بلاؤں۔ لعنت ہے جو ایک صندوق بھی نہ اٹھا سکے۔ بس یہ کم بخت تو کھانا اور مستانا جانتے ہیں۔" اماں جی نے انھیں دیکھا اور بیچارگی سے اپنی انگلیاں مروڑنے لگیں۔ وہ خاموش تھیں۔ ان کے ہاتھ آگ تاپتے ہوئے کانپ رہے تھے۔

برف گر رہی تھی۔ اس کے نرم نرم گالے تتلیوں کی طرح ناچتے ہوئے کھڑکیوں کے شیشے پر چپک جاتے تھے۔ ابا جی کھڑکی کی طرف بڑھے "بس یہی کسر رہ گئی تھی، برف کو بھی آج ہی گرنا تھا۔ سارے صندوق رات بھر برف کے نیچے دبے رہے تو ظاہر ہے انھیں زنگ لگے گا اور میں مجبوراً انھیں او[illegible] پڑے گا۔ واہ مولا تیرے قربان جائیے۔" پھر وہ ماشاء اللہ کی طرف پلٹے۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی وہ اسے اٹھا دیں گے اور تمام صندوق اندر لے آئیں گے۔ لیکن جب وہ اس کے سرہانے پہنچے تو ان کے غصے اور مایوسی کی انتہا نہ تھی۔

"بالکل ہی بے ہوش ہے کم بخت۔ مولا کے قربان جایئے اب یہ گدھا، لنڈھور کی اولاد تو یہاں سو تا رہے اور صندوق باہر برف میں زنگ کھاتے رہیں۔ اس کے بعد وہ ہماری طرف آئے" اگر ذرا سی ہمت سے کام لے کر یہ صندوق اندر لے آئیں تو کتنا اچھا ہو۔" اماں جان اپنی جگہ سے ہلیں تک نہیں۔ اباجی نے ان کے پھولے ہوئے پیٹ کی طرف دیکھا، مجھ پر ایک نظر ڈالی اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگے۔" کاش میں نے کوچوان سے جھگڑا نہ کیا ہوتا۔ اس گھڑی موت آگئی ہوتی مجھے تو اس وقت میں یوں اکیلے نہ ہوتا۔" پھر بڑبڑائے۔" چلوں خود ہی دیکھوں کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں، اگر زنگ لگ گیا تو قیمت آدھی رہ جائے گی۔ میرا تو دیوالہ نکل جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئے مگر فوراً ہی ہانپتے کانپتے لرزتے ہوئے واپس آئے اور اپنے کپڑوں اور سر سے برف جھاڑتے ہوئے بولے۔" نہ بھئی مجھ اکیلے کے بس کا روگ نہیں۔ اب اس برف کے طوفان میں کوئی مزدور بھی کم بخت نہیں ملے گا۔ اللہ کی مصلحت کے قربان جایئے ہر بات میرے خلاف ہو رہی ہے۔" وہ پھر کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے اور بڑبڑانے لگے۔ میری اماں جان ماشاء اللہ کے سرہانے بیٹھی بار بار اس کا پسینہ پونچھ رہی تھیں کبھی کبھی اچانک سر اٹھا کر وہ اباجی کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتیں جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر ڈر کے مارے منہ سے بات نہ نکل رہی ہو، پھر ان کا سر جھک جاتا۔ ان کی نگاہوں میں انتہائی بے بسی اور لجاجت تھی، ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

رات کے آخری حصے میں ماشاء اللہ نے آنکھیں کھولیں اور بخار سے سرخ آنکھوں سے ہمیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اباجی بے حد خوش خوش اس کے پاس آئے اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔" ماشاء اللہ کیا بات ہے! کہاں درد ہے تیرے۔ نہ بابا! گھبرانے کی کوئی بات نہیں بس ذرا سا تھک گیا ہے تو۔" اس کے بعد اس پر جھک کر بڑے اشتیاق سے بولے۔

" پہلوان، ایک منٹ کے لئے باہر چل سکتا ہے۔ مل کر صندوق برف سے نکال لیں ورنہ سارے کے سارے زنگ لگ کر خراب ہو جائیں گے۔"

ماشاء اللہ نے غبار آلود حیران نگاہوں سے انھیں دیکھا اور ایک بے رنگ سی

مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اباجی نا امید ہو کر وہاں سے اٹھ گئے اور اپنے آپ سے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگے۔

"کیا نصیب ہے ہمارا بھی، ذرا دیکھو تو بھلا کیا حال ہو گیا ہے اس کا۔ کسے خبر تھی کہ یوں ہو جائے گا ——— کسے خبر تھی ———" اور پھر خود ہی گویا جواب دیا "نہیں بھئی، تمہارا کیا خیال ہے، اسے کیا ہو گیا ہے، بس ذرا سا تھک گیا ہے، سوئے گا تو صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے بعد پھر وہ ماشاءاللہ پر جھک کر اسے تسلی دینے لگے "پہلوان، صبح جو تو سو کر اٹھے گا تو بالکل ٹھیک ہو گا۔ تو دیکھ لیجیو، تجھے کچھ نہیں ہوا ہے ——— پہلوانوں کو بھلا کیا ہو سکتا ہے۔"

ماشاءاللہ نے اباجی کی طرف ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور ایک تھکی تھکی مردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کنارے پر جم گئی۔ جیسے اباجی کے کہنے کی تصدیق کر رہا ہو۔ "ہاں مجھے تو کچھ نہیں ہوا!"

وہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اسی طرح قائم رہی۔ اس کی آنکھیں چھت پر ایک نامعلوم نقطہ پر ٹھہر گئیں اور سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

(ترجمہ: بیگم ممتاز مرزا)

سفارش

محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار ٹانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں، مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی ٹانگا نہیں تھا۔ مجھے کافی دور بھی جانا تھا اور جلدی پہنچنا تھا اس لیے ٹانگے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتا دیکھا تو پکارا "بھئی فیکے۔ ٹانگا کہاں ہے؟ ٹانگا لاؤ نا۔"

"ٹانگا تو بابوجی، آج نہیں جوڑا ہے۔" فیکے نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ فیکا، جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا آج اتنا معصوم لگ رہا تھا جیسے پہلی جماعت میں داخلہ لینے آیا ہے۔ اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرمے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

"کیا بات ہے فیکے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "بابوجی ایک کام ہے۔"

"ہاں ہاں کہو" میں نے کہا۔

"کام یہ ہے بابوجی کہ آپ میرے بابا کو دیکھ آئیں نا؟" فیکا بولا۔ "اس کی ایک آنکھ نکل گئی ہے۔"

"اوہو" مجھے دکھ ہوا۔ "کیسے نکل گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟"

"نہیں جی۔" نیکے کے چہرے پر بھولپن کا ایک اور چھینٹا پڑ گیا۔ "لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار ٹانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی، کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو سانڈے کا تیل بیچنے والا ایک حکیم، سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور یہی بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کر کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔" میں نے بھی کہہ دیا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا کے۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی۔ اس نے "لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ" پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی، قسم کھا کر کہتا ہوں جب سے اب تک آنکھ لگی ہو تو اپنے باپ کا نہیں ۔۔۔ بابو جی، آپ تھک تو نہیں گئے؟ سگریٹ والے کی کرسی اٹھا لاؤں؟"

اس وقت نیکا مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گدڑے کا حیران سر رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا "تم بھی حد کرتے ہو نیکے۔ اب آگے بھی کہو۔"

نیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی اور وہ بولا۔ "بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے، رات تو بابا نے چیخ چاخ کے گزار دی، پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چاچا شیدے نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں اُبالو اور اس پانی سے آنکھ دھوؤ۔ دھوئی، پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ اُبال کر باندھ لو ۔۔۔ باندھا، اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو، آنکھ کا دیا تو بجھ گیا۔ ہمارے گھر میں تو پٹس پڑ گئی بابو جی۔ اسے ایک ہسپتال میں لے گئے پھر دوسرے میں لے گئے۔ دونوں میں جگہ نہیں تھی۔ دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میو ہسپتال میں چوکیدار ہے۔ اس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی ہے پر برانڈے میں۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں، پر بابو جی، شام ہونے کو آئی ہے

اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر آیا، کوئی نرس بھی ادھر نہیں آئی۔ آپ صاحب لوگ ہیں۔ یہ لیجیے۔ ہاتھ باندھتا ہوں، میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے کہہ دیجیے کہ صدیقے کو ذرا سا دیکھ لے۔"

میں نے کہا۔ "وہاں ایک ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالجبار۔ ان سے میرا سلام کہو۔ کام ہو جائے گا۔ نہ ہوا تو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے۔ نام یاد کر لو۔ ڈاکٹر جبار۔"

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹانگا مل گیا۔ جب ٹانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ہسپتال کے ایک چوکیدار سے باتیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتہ پوچھ رہا ہو گا۔

ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال میں جا کر جبار صاحب سے کہہ دوں۔ مگر اب ٹانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا اور دس منٹ تک گرا رہا۔ پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو یکایک جبار صاحب کا سکوٹر میرے ٹانگے کے قریب سے زن سے نکل گیا۔ "جبار صاحب" میں چلایا، مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں۔ میں نے سوچا، کل کہہ دوں گا۔ کل پہلا کام یہی کہہ دوں گا۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہہ گیا ہے کہ بابو جی آئیں تو مجھے بلا لیں۔

میں نے سوچا اس وقت کون بلائے۔ اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکریہ صبح قبول کر لوں گا اور اگر کام نہیں ہوا تو جب بھی جو کوشش ہو گی، صبح ہی کو ہو گی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے۔

"یعنی تمہارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے ہی میں پڑا رہا؟" میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

"جی ہاں" وہ بولا "مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابوجی۔ آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا۔ دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں۔"

"اور اس کی آنکھ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو چلی گئی بابوجی۔" فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا "جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتالوں میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہوگا، روپیہ بھی ضائع ہوگا۔"

فیکا بولا "بابوجی کیا پتہ آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا کوئی کھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے۔ چولھا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتہ کوئی چنگاری سلگ ہی رہی ہو۔"

میں اس بات سے چونکا۔ آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ پھر وہ عاجزی سے بولا "بابوجی ذرا میرے ساتھ چلے چلیے۔"

میرے جسم میں سے نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ پھر نہانا تھا، شیو کرنا تھا، چائے پینا تھی۔ میں نے کہا "میں تمہیں اپنا کارڈ دے دیتا ہوں وہ ڈاکٹر جیبا کو دکھا دو۔ بڑے یار آدمی ہیں۔ فٹافٹ کام کر دیں گے۔ تمہارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے پھر علاج کے لیے میں خود جا کر کہوں گا۔"

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہان کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہو۔ میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا کہ "ڈاکٹر صاحب اس کا کام کر دیجیے بے چارہ بڑا ہی غریب

آدمی ہے۔ دعائیں دے گا۔" اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا کہیں تھوڑی بہت رمق باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا۔ شام کو اس نے مجھے بتایا کہ "جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ۔ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھٹنا پاجامے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابوجی!"

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا۔ اب تو شام ہو گئی ہے۔

دوسرے روز سویرے ہی مجھے شیخوپورے جانا پڑ گیا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا مگر فیکا نہ آیا۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے۔ اتنے میں فیکا بھی آنکلا۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی اس لئے جھوٹ بولنا پڑا۔
"کیوں فیکے۔ جبار صاحب نے کام کر دیا نا؟"

وہ بولا "مگر بابوجی وہ تو مجھ سے ملے ہی نہیں۔"

میں نے فوراً کہا "میں نے انھیں فون کر دیا تھا۔"

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی لَو جاگ اٹھی "جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ دیکھو بڈھے کو تکلیف نہ ہو۔"

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ میرے قدم تو آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جا رہا تھا۔

رات کو نیند نے ندامت دور کر دی مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا "آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا تھا پر اب انھوں نے بابا کو ادھر کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابو جی۔ آج میں اماں کو ساتھ لے کر گیا۔ دو روپے گل ہو گئے۔ کچھ ہو سکے تو کیجئے۔"

میں نے کہا "میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں۔"

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔ پانچ چھ روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا نظر بچا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں۔ مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا "بابو جی۔ مجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا۔"

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا "واپس آ گیا نا ہمارا بابا؟"

فیکا بولا "واپس بھی آ گیا اور آپریشن بھی ہو گیا۔ جمعے کو پٹی کھل رہی ہے۔ دعا کیجیے۔"

میں نے کہا "اللہ رحم کرے گا۔"

پھر وہ جمعے کی شام کو آیا تو بولتے ہی زار زار رونے لگا "بابو جی۔ بڑا غضب ہو گیا۔ پٹی کھلی تو پتہ چلا، ایک آنکھ تو گئی ہی تھی، دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے اپریشن کا زخم بھرے تو دوسرا اپریشن ہو گا اور دوسری آنکھ کا بھی ہو گا۔"

میں نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا، مگر بدقسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ ہسپتال میں نہ ہوئے تو انھیں گھر میں جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جا تو نہ سکا، البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔

ادھر فیکا بھی غائب ہو گیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے آکر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے۔ میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا تھا۔ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا "کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں؟"

"جی ہاں" نوکر بولا۔ "بس مُنہ سے نکل گیا۔"

"بڑے احمق آدمی ہو" میں نے اسے ڈانٹا اور کہا "جاؤ، کہہ دو کپڑے بدل رہے ہیں۔ آتے ہیں۔"

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں کتنا چھوٹا آدمی ہوں۔ دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لاکھ روپے کی بھی بات نہیں ہے۔ دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر لینا چاہئے کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اسے سچی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دُکھ بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکا چھوٹتے ہی زار زار رونے لگا۔ "بابو جی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ — کچھ سمجھ میں نہیں آتا" اس کی آواز بھرا گئی اور جھک کر اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔

میرے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ بمشکل میں نے کہا۔ "فیکے۔ بات یہ ہے فیکے کہ — بات یہ ہے ......"

آنسوؤں سے بھیگا ہوا، بچوں کی طرح گول گول سرخ سرخ چہرہ لئے فیکا اٹھا اور بولا "بابو جی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں۔ میرا بابا ٹھیک ہو گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے دی ہے۔ آپ نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی۔ قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔"

اور میں نے ایک بہت لمبی، بہت گہری سانس لے کر کہا۔ "کوئی بات نہیں فیکے،

ترکی — عزیز یسین

دُم فیکٹری

اس ضلع کے دیہات سے گذرتے ہوئے ہم نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ کتے تو بہت نظر آئے مگر اُن میں سے کسی کے بھی دم نہیں تھی۔ میں نے اپنے گائیڈ ٹیچر سے کہا: "یہ تو مشہور بات ہے کہ لوگ دوسروں کے کتّوں کے کان کاٹ کر اور نمک مرچ لگا کر اپنے کتوں کو کھلا دیتے ہیں تاکہ وہ زیادہ خوں خوار ہو جائیں، مگر یہ دم کاٹنے والی بات تو کبھی سننے میں نہیں آئی۔"

وہ بولے: "ہو سکتا ہے یہ کتوں کی کوئی خاص قسم ہوتی ہو۔" پھر ایک گاؤں میں ہم نے ایک بوڑھے کے یہاں کھانا کھایا تو اس سے بھی یہی بات پوچھی، وہ مسکرا کے بولا: "اس کی ایک کہانی ہے۔ اگر آپ بور نہ ہوں تو سناؤں۔" اور اس نے یوں بیان شروع کیا:

"ایک بار حاکم ضلع نے ہمارے گاؤں میں ایک حکم بھیجا — وہ حکم یہ تھا: "آپ کے گاؤں کو ہر سال تیس عدد سؤر مارنے ہوں گے۔" ہم لوگوں نے یہ حکم سُنا تو حیران رہ گئے، پھر گاؤں والوں نے مجھ سے کہا کہ بھائی صاحب، ایسے قصّوں کو آپ ہی نبٹا سکتے ہیں، ذرا جا کر حاکم ضلع سے بات تو کیجئے یہ کیا معاملہ ہے — تو میں گیا اور میں نے کہا۔ "حضور، میں نے پندرہ سال فوج میں گزارے ہیں، یمن میں رہا، کنا کلے گیا، کاکیشیا تک بھیجا گیا۔"

حاکم ضلع میری بات کاٹتے ہوئے بولا: "تو کس پر احسان کیا؟ آپ اپنا حب الوطنی

کا فرض ادا کر رہے تھے، تو کیا اب آپ انعام اکرام کی امید میں آئے ہیں، جائیے، مجھے مت پریشان کیجئے، مجھے بہت کام ہے۔"

"لیکن حضور، آج تو میں ایک اور ہی بات کہنے آیا ہوں۔ تو پھر آزادی کی جدو جہد شروع ہو گئی اور میں والنٹیر بن گیا، میں نے کچھ دوستوں کو آمادہ کیا اور ہم لوگ پہاڑوں میں چھپ گئے۔ جب سب کچھ ختم ہو گیا تو حکومت نے مجھے ایک بڑا سا کاغذ دیا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ میں ایک دستے کا کمانڈر رہ چکا ہوں۔"

"تو اب اس بک بک کا کیا مطلب ہے؟ آپ کی وجہ سے میرے ضروری سرکاری کام رکے ہوئے ہیں، جلدی سے کہہ بھی چکئے کہ اس وقت آپ کس مقصد سے آئے ہیں؟"

میں بڑے اطمینان سے بولا۔ "اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم فتح یاب ہوئے، میں گاؤں واپس ہوا تو میرے جسم پر تلواروں کے گھاؤ کے اور گولیوں کے چھیدوں کے نشان تھے..."

حاکم ضلع نے پھر بے صبری سے میری بات کاٹی: "تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے آزادیٔ وطن کی خاطر جو خدمات انجام دیں، ان کا مالی بدلہ چاہتے ہیں اب؟ آپ کو شرم نہیں آتی — دیکھتے نہیں ہمارا ملک کتنا غریب ہے۔"

میں نے کہا۔ "حضور، وہ تو میں دیکھتا ہوں، مجھے بہت افسوس بھی ہوتا ہے، اللہ کی قسم، مگر حضور میں اور بھی تو بہت کچھ دیکھتا ہوں، مثلاً یہ کہ پٹواری صاحب نے پچھلے ہی ہفتے میرا لال بیل چھین لیا اور کسی نے میری فریاد نہیں سنی۔ خیر ویسے قومی خدمات کے عوض میں تو مجھے لال فیتے میں بندھا ہوا ایک تمغہ مل چکا ہے سرکار — اور ایک سرٹیفکٹ بھی جس پر میرا نام سنہرے حرفوں میں لکھا ہے اور سرکاری مہر بھی لگی ہے — اور پھر یہ بھی ہوا کہ ایک پڑھے لکھے ٹیچر گاؤں میں آئے تھے، انھوں نے جاڑوں کی لمبی لمبی راتوں میں مجھے بٹھا بٹھا کر مجھ سے میرا سب حال پوچھا اور لکھا اور شہر کے کسی بڑے اخبار میں چھپوا بھی دیا۔ پھر ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا جو شہر میں پڑھتا ہے وہ جب گھر آیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ چچا کو واس

تمہارے متعلق تو شہر کے اخبار میں چھپ گیا اور لکھنے والے کو انعام بھی ملا ہے، تو حضور اس چالاک ٹیچر نے یہ کیا — زندگی تو میری بچی اور دام اپنی جیب میں رکھ لئے۔ خیر، مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں — اور پھر دار السلطنت سے ابھی تھوڑے دن ہوئے میرے پاس ایک خط آیا کہ تم پریڈ میں آؤ، تمہیں لفٹننٹ کا درجہ دیا گیا ہے مگر یونیفارم تمہیں اپنے پاس سے بنانی پڑے گی — تو حضور یہ میری عزت افزائی تو ہے مگر اب میں بوڑھا ہوا، یونیفارم پہننا بھی بھول گیا اور پھر میرے پاس اتنے پیسے تو ہیں نہیں کہ گھر کے لئے ایک نئی کلہاڑی خرید لوں، سو میں یونیفارم کہاں سے بنا سکتا ہوں۔"

حاکم ضلع نے کرسی پر پہلو بدلا۔ "اوہو، یہ تو سب ٹھیک ہے مگر اس وقت آپ کیا چاہتے ہیں، کیوں آئے ہیں، میں آپ کو پاشا بنا دوں؟ مجھے ہی دیکھئے، اتنے سال پڑھا لکھا اور اب ریزرو میں لفٹننٹ ہوں۔"

میں نے کہا: "حضور میری اس وقت کی حالت پر نہ جایئے، ایک وقت ایسا تھا کہ میں پانچ سواروں اور ہزار پیدلوں کا افسر تھا، میں نے بہتیرے دشمنوں کی پیٹھ دیکھی ہے، ڈھیروں بے ایمانوں کو جہنم واصل کیا ہے، اب مجھے زندہ ہی کتنے دن رہنا ہے، اب تو اگر وہ مجھے جنرل بھی بنا دیں، پنشن بھی دے دیں تب بھی میں کسی کی تابعداری نہیں کروں گا — بہت کی۔"

"اچھا تو آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"اس وقت تو مجھے گاؤں کے لوگوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کے یہاں سے یہ حکم گیا ہے کہ ہر سال تیس جنگلی سور مارے جائیں تو اسی سلسلے میں آپ کو ذرا تکلیف دینے چلا آیا کیوں کہ میرے علاوہ گاؤں کے کسی آدمی نے جنگلی سور دیکھا تک نہیں ہے اور میں نے بھی حضور بس گلیشیا کے محاذ پر دیکھا تھا — پوچھئے کیسے — تو ایسا ہوا تھا کہ وہاں ہمارے ساتھ ایک لفٹننٹ تھا حاتم بے، خدا جانے وہ اب کہاں ہے، اگر مر گیا ہے تو اس پر اللہ کی مغفرت اور اگر زندہ ہے تو خدا کرے ہم لوگوں کو محبت سے یاد کرتا ہو — تو حضور وہ بڑا زوردار افسر تھا۔

یہ جتنے بڑے ضلع کے آپ افسر ہیں نہ، ایسے ایسے تو دو ضلعوں کو وہ سنبھال سکتا تھا۔ خیر۔ تو ایک دن میں اور وہ رات کو گشت پر تھے کہ ایک گولی میری ران میں آلگی مگر میں نے پرواہ نہیں کی۔ اس زمانہ میں لوگ ذرا مضبوط کاٹھی کے ہوا کرتے تھے، ایک دو گولی کو تو ہم لوگ دھارتے ہی نہیں تھے مگر سرکار میں ایک بار گر پڑا، پھر اٹھ کر لنگڑاتا چلنے لگا تو وہ سمجھ گیا ـــ اور اس نے جو دیکھا تو گولی ـــ پھر وہ مجھے مورچے پر جرمنوں کا جو ہسپتال تھا، وہاں لے گیا ـــ اور وہاں میں نے زندگی میں پہلی بار سور دیکھا۔ جرمنوں کو سور کا گوشت بہت بھاتا ہے نہ ـــ مگر پھر اس کے بعد مجھے اتنا ڈر لگنے لگا کہ جب تک میں اس ہسپتال میں رہا میں نے گوشت ہی نہیں کھایا کہ کہیں یہ بدبخت مجھے کبھی سور نہ کھلا دیں۔ معاف کیجئے گا سرکار، بات ذرا لمبی ہو گئی، آپ کا حرج ہو رہا ہے ـــ تو مختصر یہ کہ میرے سوا میرے گاؤں میں کسی نے سور دیکھا تک نہیں ہے"

حاکم ضلع غصّے کے مارے چیخ کے بولا: "دیکھا یا نہیں دیکھا، یہ سب کچھ میں نہیں جانتا ـــ اب آپ مجھ سے ایک لفظ نہیں بولیں گے۔ سال کے آخر تک آپ کے گاؤں کو تیس سور مارنے ہیں اور بس، کم از کم اسی بہانے آپ کے گاؤں والے یہ تو دیکھ لیں گے کہ سور کیسا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا: "سرکار، افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں یا آس پاس سور ہیں ہی نہیں ـــ ہم تو بس سور کی گالی جانتے ہیں۔ اگر کسی نے زیادہ پریشان کیا یا کوئی ذلیل حرکت کی تو اسے سور کا بچہ کہہ دیا اور بس۔ اس کے علاوہ اصلی جیتا جاگتا سور ہم نہیں جانتے۔"

حاکم ضلع نے فائلوں کا ایک انبار میرے سامنے پٹکتے ہوئے کہا: "ذرا یہ دیکھ لیجئے۔ آپ لوگ بے وقوف ہیں، آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ سرکار کو آپ کی بہتری کی فکر ہے اور آپ لوگ ہیں کہ . . . ذرا دیکھئے، کتنا کام ہوا ہے، یہ سب یہاں تحریر ہے، سیاہ سفید

میں موجود ہے ۔ آپ کو پڑھنا آتا ہے ؟ ‘‘

’’جی نہیں ۔‘‘

’’ارے ، اور آپ افسر تھے ؟‘‘

’’مگر حضور، اس سے افسر ہونے میں کیا فرق پڑتا ہے ؟ ‘‘

’’بکواس بند کیجئے اور میری بات غور سے سنئے ۔۔۔ ان کاغذات میں لکھا ہے مکا کے کھیتوں و دیگر اناج کی کاشت کا سب سے بڑا دشمن یہ کالا جانور ہے اور اناج سرکاری مالیات کا سب سے بڑا ذریعہ ۔ چنانچہ سرکاری مالیات میں اضافہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام جنگلی سوروں کو جان سے مار دیا جائے ۔۔۔ اب آیا سمجھ میں ؟ سرکاری مالیات میں اضافہ کرنے کے لیے ۔ ۔ ۔ ٹرکی زبان سمجھتے ہیں آپ ۔ ۔ ۔ اچھا تو سرکاری مالیات میں اضافہ کرنے کے لیے ۔ ۔ ۔ آیا سمجھ میں ۔‘‘

’’جی یہ تو سیدھی سادی سی بات ہے ، کیوں نہیں سمجھ میں آئے گی ، میں بالکل سمجھ گیا ، بیشک کالے جانور کو مارنا ضروری ہے مگر وہ ہو جب نہ ۔ حضور اگر آپ دکھا دیجئے کہ وہ کہاں ہے تو ہم مار دیں گے ، بالکل مار دیں گے ، ہم سے بچ کر وہ کہاں جا سکتا ہے ۔ مگر ہم لوگ تو مکا اُگاتے نہیں ہیں ، ہمارے باپ دادا بھی نہیں اُگاتے تھے ، ہم اناج بوتے ہی نہیں ہیں ۔‘‘

’’نہیں اُگاتے تھے تو اب اگائیے ، اسی بات پر اگائیے ، اِدھر اُدھر مٹر گشتی کر کے وقت ضائع کرنے کے بجائے اناج اگائیے ، پھر جنگلی سور ضرور آپ کے کھیتوں میں آئیں گے اور اور آپ انھیں مار کر اپنی سرکار کی خوشنودی حاصل کیجئے ۔‘‘

’’حضور ہم تو اناج ضرور اگائیں ، شوق سے ، خوشی سے ، مگر یہاں کی زمین میں مکا یا دیگر اناج کیوں کر ہوں گے سرکار ، آپ کو تو معلوم ہے کہ یہاں سردی چھ چھ بلکہ آٹھ آٹھ مہینے رہتی ہے ۔ ساری زمین تو برف سے ڈھکی رہتی ہے حضور ۔‘‘

’’بس آپ لوگوں کا یہی وطیرہ ہے کہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کام سے بچ جائیں ۔

امریکہ کے کسانوں کو دیکھئے، وہ قطب شمالی کی برف پہ کارنیشن کے پھول اُگا سکتے ہیں، اور آپ لوگ ان سے کچھ سبق نہیں لے سکتے۔"

اس بات پر مجھے بھی غصّہ آگیا "جن لوگوں نے یہ حکم نکالا ہے ان سے کہئے اس سال برف باری روک دیں، پھر ہم مکا بھی اُگا دیں گے، جو اناج کہئے گا اگا دیں گے، پھر سور آجائیں گے تو ہم انھیں مار بھی دیں گے، تیس کیا ساٹھ سور گنوا لیجئے گا۔"

حاکم ضلع چیخ کے بولا "ذرا زبان سنبھال کے بات کیجئے، آپ ایک افسر کی ہتک کر رہے ہیں، آپ کو اس جرم میں دو سال کی سزا ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا: "جناب عالی! مجھ جیسا حقیر پر تقصیر کیوں کر آپ جیسے افسروں کی ہتک کر سکتا ہے مگر بد قسمتی سے ہمارے گاؤں میں سور ہیں ہی نہیں۔"

"آپ اپنی ہی کہے جائیں گے۔ آپ کے گاؤں میں جنگلی سور ہیں یا نہیں، یہ آپ کو زیادہ معلوم ہے یا یہ آرڈر نکالنے والے افسران بالا کو معلوم ہے، کیوں؟ فوراً جواب دیجئے۔"

"دیکھئے حضور، ہم تو ٹھہرے بھولے بھالے، سیدھے سادے لوگ، اور میں بھلا آپ کو جواب کیا دے سکتا ہوں، البتہ سور ہمارے گاؤں میں نہیں ہیں۔"

حاکم ضلع مجھ پہ چیخے گیا۔ "جن لوگوں نے یہ آرڈر بھیجا ہے انھوں نے بہت سارے نقشے دیکھے، ڈھیروں کتابیں پڑھیں، بیسیوں جگہ کا دورہ کیا تب بہت سی معلومات سے انھیں یہ پتہ چلا کہ آپ کے گاؤں میں جنگلی سور ہیں۔ مجھے بھی کوئی شبہ نہیں کہ ضرور ہوں گے۔ آپ نے انھیں دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، آپ کو ان کے متعلق معلوم ہو یا نہ معلوم ہو۔ اگر افسران بالا کہتے ہیں کہ ہیں تو ہوں گے، آپ لوگ اپنی آنکھیں کھول کر دیکھئے تو سہی۔"

"وہ تو ہم کھول لیں گے حضور، مگر اللہ تعالے کی قسم ہمارے گاؤں میں سور نہیں ہیں۔"

"اوہو، آپ کی کھوپڑی میں ضرور بھیجے کے بجائے بھوسہ بھرا ہے! ہم تو آپ لوگوں کے فائدے کے لئے اتنی ریسرچ کر رہے، کام کر رہے، آپ کو ایک ترقی یافتہ قوم بنانا چاہیں اور آپ کی

مجھ ہی میں نہ آئے کچھ — یہ آرڈر خود وزیر زراعت کا نکالا ہوا ہے سمجھے — ' انھوں نے تمام ضلعوں کو بھجوایا، حاکموں کو حکم دیا کہ ہر علاقہ میں، ہر گاؤں میں ایک مقررہ تعداد میں سور مارے جائیں — تو پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ . . . . اچھا تو . . . . تو پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ حاکم ضلع خود سور مارنے نکل پڑے گا — یہ دفتر کون سنبھالے گا۔ اسی لئے گاؤں گاؤں آرڈر بھیجا گیا کہ ہر گاؤں میں اتنے سور مارے جانے چاہئیں — اور یہ آرڈر آپ گاؤں والوں کو ہم حکام ضلع نے بھیجا — آپ بتائیے اور کس طرح کرتے۔ آپ احمق ضدی لوگ ہیں حالانکہ میں نے بڑے انصاف کے ساتھ ہر گاؤں کو سوروں کی برابر تقسیم کی ہے — آپ کے گاؤں کو تیس سور دینے ہی پڑیں گے۔''

''حاکم صاحب' آپ ضدی کہئے تو بھی ہیں اور احمق کہئے تو بھی ہیں — مگر معاف کیجئے گا جنگلی سور جب ہمارے گاؤں کے آس پاس تک نہیں ہیں تو کیوں کر اسے . . . ''

''لاحول ولاقوۃ، تو آپ کا خیال ہے کہ زراعت کے وزیر صاحب کو بھی پتہ نہیں ہے کہ آپ کے گاؤں میں کالا جانور ہے کہ نہیں اور وہ تمام ایڈوائزر اور اسسٹنٹ جنھوں نے یورپ اور امریکہ کے اسکولوں میں زراعت کی تعلیم پائی ہے وہ بھی سب جاہل ہیں، حاکم لوگ اور ضلعدار اور پٹواری بھی کچھ نہیں جانتے، مجھے بھی کچھ نہیں معلوم — ہم سب کے سب بے وقوف ہیں، لاعلم ہیں۔ علم ہے تو صرف آپ کو، آپ جانتے ہیں ان باتوں کا کیا مطلب ہوا؟ پہلے تو آپ نے میری ہتک کی اور اب وزیر زراعت اور سارے افسران کی ہتک کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جی حضور' یہ سب تو میرا مطلب نہیں تھا۔''

حاکم غصے کے مارے کرسی سے اچھلا اور پھر بیٹھ گیا اور چیخا۔ ''آخر حکومت آپ لوگوں سے کوئی مفت میں سور تو مانگ نہیں رہی ہے، اگر آپ سور کی ایک دُم لے آئیں تو میں آپ کو سرٹیفکیٹ دے دوں گا، آپ اس پر پٹواری سے مہر لگوا کر بینک لے جائیے تو آپ کو بارہ کرش مل جائیں گے۔ اور آپ کیا کیجئے گا؟ اب آپ کی سمجھ میں آیا کہ اس میں آپ کے لئے کیا فائدہ ہے؟ ہم لوگوں نے

جنگلی سور سے جنگ شروع کر دی ہے اس پر دھاوا بول دیا ہے ۔۔ اچھا آپ بتایئے گیہوں کے کیا کیا دام ہیں ؟ ایک کیلوگرام گیہوں کتنے میں ملتا ہے ؟ ''

'' جی بینک اٹھ کرش دیتا ہے ۔''

'' تو اب آپ ہی دیکھئے کہ سور کی ایک دم ڈیڑھ کیلوگرام گیہوں کے برابر ہوئی کہ نہیں ۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو کھیتوں میں مرنے کھپنے یا گلے پالنے میں اپنی جان کھپانے کے بجائے بس حکومت کے ہاتھوں سوروں کی دُمیں ہی بیچا کرتا ۔۔ اچھا اب تشریف لے جایئے ، یہ بے کار کی بکواس بہت ہو چکی ۔۔ اور اگر آپ نے اس نقصان پہنچانے والے جانور کو مارنا شروع نہ کیا تو میں آپ کے پیچھے پولیس والوں کو لگا دوں گا ، پھر وہ لوگ آپ کو سمجھا دیں گے کہ کیا کرنا چاہیئے ۔''

میں نے کہا '' اللہ تعالےٰ آپ کی حیات میں برکت دے '' اور وہاں سے چل پڑا ۔

گاؤں پہنچ کر لوگوں کو جو میں نے حاکم ضلع کی کہی ہوئی ساری باتیں بتائیں تو کوئی کچھ کہنے لگا کوئی کچھ ۔ کسی نے کہا '' بھئی میں بتاؤں ، ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ہم لوگ سور پال لیں کھلا پلا کے بڑا کریں پھر حکومت کے ہاتھ دمیں بیچ دیا کریں ۔''

کچھ نوجوان تو راضی ہو گئے مگر بڑے بوڑھوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا کہ حکومت کو خوش کرنے اور پیسہ کمانے کے لئے اب یہ ناپاک جانور گاؤں میں پالا جائے گا ۔ پھر ایک تجربہ کار آدمی سے رائے پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ جس علاقے میں وہ فوج میں نوکر تھا وہاں جنگلی سور کافی پائے جاتے تھے ۔ سب سوچ میں پڑ گئے ۔ پھر سب نے مل کر مجھ سے کہا کہ کوداس آغا ، ہم بتائیں کیا ۔۔ کہ آپ گاؤں والوں پر بڑا احسان کریں اگر آپ اس علاقے میں جا کر کسی طرح سوروں کی تیس دُمیں لے آئیں ! پھر سال بھر کے لئے تو جان بچ ہی جائے گی ۔ دیکھا جائے گا ۔

مگر اس جگہ جانے کے لئے دو دن تک ریل سے سفر کرنا پڑتا تھا ، میں نے بحث میں شامل ہوتے ہوئے کہا ۔ اگر آپ لوگ منظور کریں کچھ دُمیں فاضل خرید لی جائیں تو کرایہ

بھی نکل آئے گا، آخر حکومت بارہ کرش فی دم تو دے ہی رہی ہے، دس بیس زیادہ ہو جائیں گی تو بھی لے لے گی۔"

سب نے میری تجویز کو پسند کیا، ہم لوگوں نے سفر کا خرچ بینک سے قرض لیا، میں نے دو خالی تھیلے لئے اور چل پڑا۔ اپنی منزل پر تو میں خیریت سے پہنچ گیا لیکن وہاں ایک تشویش کی بات یہ معلوم ہوئی کہ اگرچہ جنگلی سور تو اس علاقے میں کافی تھے مگر صرف ہم نے ہی چالاکی نہیں کی تھی۔ اور بھی بہت سے دیہات سے لوگ دُمیں خریدنے پہنچ گئے تھے، بلکہ بعض ہوشیار لوگ تو دُموں کے بڑے بڑے ڈھیر مول لے کے جا بھی چکے تھے۔ چنانچہ دموں کی مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے فی دم بیس کُرش کا بھاؤ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ برے پھنسے، اب کیا کریں، اس طرح تو ہم لٹ جائیں گے۔ کرایہ بھی خرچ ہوا ہے اور اگر بارہ کرش کے حساب سے ان کم بخت دموں کو حکومت کے ہاتھ بیچا تو پھر کیا بچے گا، اُلٹے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کرایہ تک نہیں نکل پائے گا۔

چنانچہ میں نے مول بھاؤ پہ جھگڑنا شروع کیا اور بڑی جھک جھک کے بعد پندرہ کرش فی دم کے حساب سے خریدیں، سرائے واپس آیا، وہاں لوگوں کو دکھائیں تو وہ ہنسنے لگے۔ "ارے بے وقوف، کیا گھاس کھا گیا ہے، کبھی سور کی دُم نہیں دیکھی؟"

"کیوں، کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے بوکھلا کے پوچھا۔

"یہ سور کی دُمیں ہیں ہی نہیں، کتّوں کی ہیں۔"

ہوا یہ تھا کہ کسی چالاک نے کتّوں کی ڈھیر ساری دُمیں کاٹ کر، تیل میں بھگو کر، دھوپ دکھا کر سیاہ کر لی تھیں اور سور کی کہہ کر میرے ہاتھ بیچ دیں۔ تو میں غچہ کھا گیا تھا۔۔۔ اب کیا کروں؟

سرائے کے لوگ بولے: "ہمت کرو، ان میں سے ذرا ذرا سا اور چھانٹ دو اور تھوڑا سا تیل چپڑ کر حاکم ضلع کو یوں بیچ دو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، وہ حاکم ٹھہرا، کیا پہچانے گا بھلا۔"

گرمی کا موسم، لمبا سفر۔ میں جو وہ دُمیں لے کر ٹرین سے چلا تو لوگ ناک بند کرنے لگے: "اُوہ، کہاں سے بدبو آ رہی ہے۔ اُنہوں، یہ کیا چیز سڑ رہی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں

گونگے کا گڑ کھائے بالکل چپ چاپ ایسا بنا بیٹھا رہا جیسے اس بدبو سے میرا دور دور کا بھی تعلق نہیں ہے ۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ آس پاس کے دیہات میں لوگوں نے جو سُنا کہ ہمارے گاؤں میں دُمیں آگئی ہیں تو سب ٹوٹ پڑے۔ ہم نے تیس دُمیں سرکار میں جمع کر دیں اور فاضل جتنی تھیں وہ پچاس کرش فی دم کے حساب سے فروخت کر دیں۔ کرایہ بھی نکل آیا فائدہ بھی ہوا، حاکم ضلع بھی خوش ہو گیا۔ ہنس کر بولا "دیکھئے، اب آپ ہی دیکھئے، آپ تو کہتے تھے کہ گاؤں میں سور ہیں ہی نہیں — ذرا ان دموں پہ غور کیجئے، جن کی یہ ہیں وہ کتنے تباہی مچانے والے، کتنے وحشی جانور رہے ہوں گے ۔"

البتہ اس دن سے لوگوں نے میرے دہلیز پر پاؤں رکھنا چھوڑ دیا اور خاص کر بزرگوں نے۔ کہتے تھے اس نے اپنا گھر ناپاک کر لیا ہے، نہ کوئی بزرگ مجھ سے ہاتھ ملانا پسند کرتا تھا، کیونکہ میں نے وہ کم بخت ناپاک دُمیں جو چھوئی تھیں۔ آخر عاجز آکر میں نے دو چار سمجھدار لوگوں کو راز بتا دیا اور صرف بتا ہی نہیں دیا، انھیں دُموں کی پیداوار کی ترکیب بھی سمجھا دی —

اور پھر تو ہمارے گاؤں میں ایک بڑا ہوشیار لڑکا تھا، وہ دُم پروڈیوسر بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں کتوں کی دُمیں نہیں ہیں۔ اب تو وہ پروڈیوسر شہر میں بھی بزنس کرنے لگا ہے — ایک دن مجھے ملا تھا۔ میں نے کہا "کہو کیسی گزرتی ہے ۔"

کہنے لگا " اللہ کا شکر ہے، کتّوں کی دموں کی بدولت میری تقدیر کھُل گئی — اب تو سمجھئے کہ میں نے دُموں کی فیکٹری کھول لی ہے ۔"

(ترجمہ : رضیہ سجاد ظہیر)

جاپان　　　　　　　　　　　　　　　　　ہوتا یوشی

پرچھائیں

کوریا میں ایک اور جنگ چھڑے بھی سال بھر ہونے کو آگیا تھا مگر جہاں وہ بوڑھا رہتا تھا اس کے آس پاس کہیں سے یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ پچھلی جنگ بھی ختم ہوئی تھی کہ نہیں۔ سب سے پہلے تو اس کے کپڑوں ہی کو لے لیجئے ــــ ایک پرانا فوجی جیکٹ تھا، پیوند لگا ہوا ــــ اور ایک عدد اسی قسم کا پتلون ــــ اور یہ دونوں کپڑے بھی اسے ایک طوائف نے دیئے تھے۔ پھر ذرا اس کا پس منظر بھی دیکھ لیجئے۔ ٹوکیو شہر ــــ اور وہاں بھی وہ اِدھر اُدھر سگریٹ کے ادھ جلے ٹوٹے سڑک پر ڈھونڈتا پھرتا اور ایسا لگتا جیسے گڑیا لڑکھڑاتی جا رہی ہو، ایسی گڑیا جو گھڑیالوں میں لگی وقت بتایا کرتی ہے! اُسے تو ٹوکیو کے بجائے برما کے جنگلوں میں کہیں ہونا چاہیئے تھا جہاں ہر قسم کی جھاڑ جھنکاڑ زمین پہ پیدا ہوتی اور موت کی خوشبوؤں میں گھل مل جاتی ہے۔ اس کے دونوں کندھوں پہ ایک ایک جھولا لٹکا ہوتا تھا جس میں کھانے کی چیزیں اتنی ہی نایاب ہوتی تھیں جتنی برما کے جنگلوں میں موت سے ہم آغوش ہونے والے سپاہیوں کے تھیلوں میں نایاب ہوتی تھی۔ البتہ اس میں ایک ٹین تھا جسے وہ پانی پینے کے پیالے کی طرح استعمال کرتا تھا، ایک ڈبیہ دیا سلائی، ایک پھٹیچر تولیہ، کچھ چاپ اسٹکیں (وہ لکڑیاں جن سے چینی اور جاپانی کھانا کھاتے ہیں) ــــ ہاں ایک اخبار بھی کہ کبھی کوئی چیز ہاتھ لگ جائے تو اس میں لپیٹ لی جائے ــــ مثلاً پڑی پڑی گری کوئی کھانے کی چیز یا کسی سائیکل کی دوڑ لگانے والے

کی پنسل جو وہ اپنے ساتھ رہنے والوں میں سے کسی سے اڑا لیتا تھا۔ یہ ہوسٹل ۔ یہ خیراتی ہوسٹل بھی فوج کی طرح تھا۔ چھوٹی موٹی چوریوں کا کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ویسے یہ "ویلفیر ہوسٹل" کہلاتا تھا اور بوڑھا رات کو یہیں سوتا تھا مگر اسے اگر "ویلفیر ہوسٹل" کہیں تو معاملہ ذرا خلط ملط ہو جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ملکوں میں بہت سے ہوسٹل ہوتے ہیں جن میں رہنے سے سماجی حفاظت بھی ہوتی ہے، مگر یہ ہوسٹل ذرا اور قسم کا تھا۔ اس کا نام بھی انوکھا ہی تھا۔۔۔ "پردہ جنت ہوٹل کا خانۂ امید"۔۔۔ ٹوکیو میں یہ "گریٹر ٹوکیو فیڈریشن آف نان لگژری ہوٹلز" کے تحت تھا اور اس کا نمبر چالیسواں ہوسٹل تھا۔ لیکن اس کو باقی دوسرے قسم کے ہوٹلوں سے الگ کرنے کے لئے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "پردہ جنت ہوٹل کا خانۂ امید" واقعی جنت اور آسمانوں اور اپنے درمیان پردوں کی آڑ رکھتا تھا۔ یعنی اس میں چھت نہیں تھی۔ بس صرف ایک مستطیل بکس کی طرح تھا جس کی دیواریں لکڑی کی تھیں اور ان دیواروں کی موٹائی بارکوں کی دیواروں کی چوتھائی تھی۔ اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب پیک کرنے کا کوئی بکس گلی کے گھورے سے اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا ہے، ابھی تک وہ بے کار پڑا دھول کھا رہا تھا، اب کسی کام آرہا ہے۔ اس "گھر" میں دراصل ایک ہی کمرہ تھا اور اسی کمرہ میں وہ تمام لوگ، بوڑھے اور جوان سبھی رہتے تھے جن کے وجود سے کسی نہ کسی قسم کے جنگی کپڑے، فوجی چیتھڑے وغیرہ لپٹے ہوئے تھے۔ پھاٹک کے ستون دو پتلے پتلے ڈنڈے تھے جن پر وہ بڑا سا بھاری بورڈ ٹکا ہوا تھا "پردہ جنت ہوٹل کا خانہ امید" اور دونوں ڈنڈوں کے سروں پر دو فوجی خود لگے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سجاوٹ کے لئے تھے یا گمنام سپاہیوں کی قبروں کی نشان دہی کر رہے تھے۔ جنگ کو گزرے چھ سال ہو چکے تھے، اونچے طبقے والوں نے جنگ کے نشانات اور آثار کو مٹانے کی کافی کوشش تو کی تھی مگر ایسی گلی میں جیسی کہ گنزا تھی، ابھی تک سپاہی اور پولس وغیرہ کے آس پاس جنگ کے باقیات پائے جاتے تھے۔ اور یہاں فقیر بھی تو تھے اور کچھ چور اچکے جو پرانے یونیفارموں میں ملبوس رہتے تھے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کی تمام سلوٹیں تو استری کر دی گئی تھیں مگر ایک شکن باقی رہ گئی ہے، لمبی سی، گہری شکن ـــ "پردہ جنت ہوٹل"!

سڑک کی دوسری عمارتوں کے بیچ میں، ان کے برابر میں کھڑا یہ لکڑی کا بکس بہت سے مردوں، عورتوں اور بچوں کو پناہ دیتا تھا ـــ اس کے اوبڑ کھابڑ مستطیل گھیرے کے اندر رہنے والے بھی کچھ عجیب بے جان سے لوگ تھے، دبلے، سکڑے یا پھر پھولے پھولے، سوجے ہوئے سے چہروں والے لوگ!

بوڑھے کا خیال تھا کہ اس پورے احاطے میں کوئی دس ہزار افراد رہتے تھے اور یہ سب ہی کسی نہ کسی مجبوری کے تحت وہاں آئے تھے، ایسے لوگ جن کا اصلی کام ان سے چھن گیا تھا، کبھی وہ کچھ اور کرتے تھے مگر پھر انھیں برسوں کے لیے، ایک وقتی ضرورت کے تحت اپنے کام سے الگ کر دیا گیا تھا اور اب وہ ضرورت ختم ہو گئی تھی اور وہ بکھر گئے تھے ـ دن بدن اس احاطے کی آبادی بڑھتی ہی جاتی تھی ـ

فوجی خود پہنے ہوئے ڈنڈوں کے بیچ میں کھڑے ہو کر بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھا، صبح کے کوئی سات ہی بجے ہوں گے مگر ابھی سے گرمی کافی بڑھ گئی تھی ـ جیسے جیسے روشنی کی کرنوں نے مٹی کو پینا شروع کر دیا ویسے ویسے یہ لکڑی کا ڈبہ جاگ پڑا، یہاں وہاں ٹین کے سائبان چرچرانے لگے، کھلی ہوئی گندی نالی کب کی سوکھ چکی تھی مگر اس کی بدبو ویسی ہی باقی تھی اور اسی بدبو میں گھلی ہوئی سڑے چمڑے اور مچھلی کی بو!

بوڑھے نے یاد کرنا شروع کیا کہ کل رات اس نے کیا کھایا تھا مگر حسب دستور اس کی یادداشت دھندلی تھی ـ کندھے جھکائے، سر نیچا کیے وہ چلنے لگا ـ پھر اس نے تیرہ ین میں اس بڑھیا سے اُبلے ہوئے آلو خریدے، جو پرانی کتابیں، رسالے کرایہ پر دینے کے ساتھ ساتھ اُبلے آلوؤں کا خوانچہ بھی لگاتی تھی ـ پھر اس نے اپنے ٹین میں پانی بھرا اور آلوؤں کے نوالوں کو پانی کے گھونٹوں سے پیٹ میں اُتارتا ہوا چل پڑا ـ

البتہ کل دوپہر کو بوڑھے نے روٹی کھائی تھی۔ آساکوسا کے روکو نامی محلے میں وہ ایک پارک میں سایہ دار پیڑوں کے نیچے بیٹھا روٹی کھا رہا تھا کہ ایک نوجوان آدمی ایک اخبار پھینکتا ہوا گزر گیا تھا اور بوڑھے نے وہ اخبار اٹھا لیا تھا، اخبار کس دن کا تھا، کس تاریخ کا، اس سے اسے کوئی خاص مطلب نہ تھا۔ بس اُسے تو یہ یاد تھا کہ اخبار کے پہلے صفحہ پر جنگ سے متعلق کچھ خبریں تھیں، دوسرے پر کچھ نوٹس، تیسرے پر باغبانی اور چوتھے پر عورتوں کے بناؤ سنگار کے متعلق ——

لیکن آپ میرے اس سب بیان سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ بوڑھے کو کسی بات میں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی ——وہ تو اخباروں کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا تھا اور ان میں کہیں نہ کہیں اپنی موجودگی کو ڈھونڈتا تھا مثلاً اگر یہ خبر ہے کہ ضلع ہاچیوجی میں کہیں آگ لگ گئی تو وہ ہاچیوجی پہنچ جاتا۔ پیدل ہی چلتا ہوا —— اگر یہ خبر ہوتی کہ فوکاگاوا میں ناجائز شراب کشید کرنے والوں کے ایک گروہ پر چھاپہ مارا گیا یا کاوآساکی میں کوئی قتل ہو گیا تو وہاں چل دیتا —— دراصل وہ اس تلاش میں تھا کہ اس کی جائے پیدائش کہاں کی ہے تاکہ وہ وہیں پہنچ جائے" وہیں رہے اور پھر وہیں مرے۔ کسی نہ کسی طرح وہ اس لکڑی کے احاطے سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

کل اُس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ شونان کے علاقہ میں وائی کے نہانے والے ساحل پر دو عورتوں نے عشق کے سلسلے میں خودکشی کر لی۔ نہ جانے کیوں اس خبر سے اُسے احساس ہوا کہ ضرور وہ خود بھی کسی ساحلی شہر میں پیدا ہوا تھا۔ مگر بہر حال اسے سمندر کے نیلے رنگوں کو دیکھے بھی بہت دن ہو گئے تھے —— اس کا عام پیشہ یہ تھا کہ تقریریں کر کے لوگوں کو اکٹھا کر لیتا اور پھر ان کے ہاتھ ربر کے برش بیچتا، اس سے کچھ پیسے بھی مل جاتے اور خوشی بھی ہوتی کہ پادریوں کی طرح منادی یا پارلیمنٹ کے ممبروں کی طرح تقریریں کر رہے ہیں۔ اور وہ یہ سوچنے لگتا کہ پہلے کہیں وہ کوئی سیاسی لیڈر تو نہیں تھا —— حالانکہ وہ یہ جانتا تھا کہ ہوسٹل میں بھی اور باہر بھی زیادہ تر لوگ اس کو پاگل سمجھتے تھے —— تو اگر تقریر، صرف تقریر کر کے تھوڑے پیسے مل جائیں پاگل بھی سمجھے جائیں

میں ایسا کیا مضائقہ تھا۔

چنانچہ آج بوڑھے کا پلان یہ تھا کہ دائی شہر جایا جائے جہاں سے وہ خود کشتیوں کی خبر لائی تھی۔ اگر وہ اپنے لکڑی کے گھر کے پاس سے ٹرام لے لے تو ایک گھنٹے میں ٹوکیو اسٹیشن پہنچ جائے گا مگر آج تک وہ اپنے گھر کے پاس والے اڈے سے کبھی سوار نہیں ہوا تھا کیونکہ اسے پیدل چلنا آہستہ آہستہ ٹہلنا پسند تھا۔ چونکہ اس طرح وہ دھیرے دھیرے یاد کرتا جاتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے اور۔۔۔ اس کے ذہن پر پڑے ہوئے سفید پردے میں بہت سے چھید ہوتے جاتے اور وہ اُن تاریکیوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا جو اس کا ماضی تھیں ۔۔ ابھی کل ہی وہ چونک پڑا تھا۔۔۔ جب وہ اخبار پڑھ کر کھڑا ہوا تھا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ رُدوکو کے میلہ میدان میں نکل آیا تھا۔ چکر گھنیاں چل رہی تھیں، ان کے گھوڑے گول گول گھوم رہے تھے، ایک چالیس پچاس سال پرانے گانے کی گونج سنائی دے رہی تھی ۔۔ اس نے آنکھ نچیا کر دیکھا ۔۔ تو سفید پردے میں یکایک ایک روزن بن گیا ۔۔ پھر کئی روزن بن گئے ۔۔ اور ان میں سے ماضی کے قہقہے سنائی دینے لگے۔ ویسے ان تمام چیزوں کا آپس میں کوئی تسلسل نہیں تھا مگر بوڑھے کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ تسلسل تو صرف جنگ میں ہوتا ہے جو ایک کے بعد ایک ہوتی رہتی ہے! اور نہ جانے کہاں اسے یہ خیال تھا کہ جب سے کوریا میں ایک نئی جنگ چھڑی ہے تب سے زندگی کچھ آسان تر محسوس ہوتی ہے، لوگ بھی اس کی تقریریں زیادہ توجہ کے ساتھ سننے لگے تھے۔

اب جب وہ صبح کو "خانۂ امید" سے نکلتا تو ذرا توجہ کے ساتھ تیار ہوتا۔ ویسے تیار کیا ہوتا تھا، کپڑے تو وہی تھے البتہ ناک کی ذرا زیادہ تیاری کرنی ہوتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ناک کا داہنا نتھنا غائب تھا، ادھر ہڈی پر گوشت تھا ہی نہیں ۔۔ "خانۂ امید" میں چالیس پینتالیس کی طوائف، بوڑھے کے پاس چٹائی بچھا کر سویا کرتی تھی اس کا خیال تھا کہ یہ آتشک کی دین ہے اور پھر آتشک کے علاج کے لئے تو ایسی دوائیاں دی ہی جاتی

ہیں جن سے بڑا تیز بخار چڑھتا ہے اور غالباً اسی بخار نے اس بوڑھے کے دماغ پر اثر کیا ہو گا اور اسی وقت سے یہ بیچارہ سڑی ہو گیا ہو گا! جبھی تو اسے کوئی بات یاد نہیں ہے!"

بہرکیف طوائف کی یہ تھیوری اپنی جگہ تھی اور بوڑھے کی کوششیں اپنی جگہ ـــ مثلاً اسی صبح کو اس نے بڑی احتیاط سے ناک پونچھ کر ربر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر ناک کی خالی جگہ پر ربر کے بینڈ لگا کر فٹ کیا اور اس ربر کو گھما کر اپنے سر پر لپیٹ لیا اور گردن پر بھی۔ ایسا کرنے سے ناک کی خالی جگہ کافی حد تک بھر گئی۔

پھر وہ سمیدہ ندی کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کر اس کے کنارے والے ٹرام اسٹینڈ پر کھڑا ہو گیا۔ ٹرام کا انتظار کرتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ایک نام بار بار دہراتا رہا ـــ یہ نام اس کے خیال میں اس کا اپنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ ریہرسل بھی کرتا رہا کہ لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لئے وہ کس قسم کی تقریریں کرے گا۔ آخر آج خاص موقعہ تھا تو اس کے لئے خاص تیاری بھی ضروری تھی۔ وہ ساحل پر جا رہا تھا جہاں ہزاروں آدمی ہوں گے، یقیناً غیر ملکی بھی ہوں گے، کم از کم اتنے پڑھے لکھوں کی تعداد تو ہو گی ہی جو پڑھ سکے کہ اس کے گلے میں لٹکی تختیوں پر کیا لکھا ہے۔ چونکہ اس کے گلے اور پیٹھ پر تختیاں لٹکی ہوئی تھیں اس لئے بوڑھے کو یہ پسند نہ تھا کہ بھری ہوئی ٹرام میں سوار ہو ـــ چنانچہ ٹرامیں ایک کے بعد ایک گزرتی رہیں اور وہ کھڑا رہا۔

پھر ایک ایک کر کے وہ بھنگی واپس ہونے لگے جو ویلفیئر ہوسٹل سے منہ اندھیرے ہی نکل جاتے تھے اور آساکوسا کی سڑکیں جھاڑ بہار کر واپس ہو رہے تھے۔ سب باری باری سے بوڑھے کو سلام کرتے اور وہ بس ٹھوڑی ہلا کر داہنا ہاتھ ذرا سا اٹھا کر ان کے سلام کا جواب دے دیتا۔ واقعہ تو یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا تھا، چاہے کوئی کتنا ہی تھکا ہوا سو رہا ہے مگر یہ لوگ اتنا غل مچاتے، برتن کھڑکھڑاتے، جوتے اتار اتار کر اس زور سے پھینکتے کہ مستقل شور ہوتا رہتا۔

بھنگیوں کی ایک ٹولی اور آئی، بوڑھے نے ناک پر سے پھسلتی ہوئی عینک کو سنبھالا ہاتھ میں تھامی بانس کی چھڑی کو یوں پکڑا جیسے کوئی سپاہی تلوار پکڑے اور سینہ پھلا لیا۔ وہ ان کے سلام کا جواب بس یوں ہی سا دے رہا تھا کیونکہ ایک تو زیادہ ہلنے جلنے اور بولنے میں اسُس

خانہ ساز ناک کے گڑبڑا جانے کا ڈر تھا، دوسرے وہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا تھا۔ ویسے بھی جب اس کے جان پہچان کے لوگ اُس سے ملتے تو اس کا داہنا ہاتھ خود بخود فوجی ٹوپی کی طرف چلا جاتا اور وہ یاد کرنے لگتا کہ شاید کبھی وہ فوجی تھا۔ کافی اونچے درجے کا فوجی۔ جنرل وغیرہ!

اتنے میں ایک ٹرام آگئی جس میں بھیڑ زیادہ نہیں تھی اور بوڑھا، اپنی تختیاں کھڑبڑاتا اس میں سوار ہو گیا، پھر اس کے کان میں کسی کی آواز آئی: "اوہو، ذرا ان کو دیکھو، دادا میاں کو۔"

آواز کچھ عجب گھسی ہوئی سی تھی، اتنی گھسی ہوئی کہ اُس میں مزاح کا نام تک نہ تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُس میں کچھ غم کی آمیزش تھی تو زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ بوڑھے کو اُن لوگوں پہ ہمیشہ بڑا ترس آتا تھا جو اس پہ ہنستے تھے، خاص کر اگر وہ لوگ نوجوان بھی ہوتے! اس نے گھوم کر دیکھا تو دو کسرتی نوجوان، دھاری دار قمیصیں پہنے کھڑے تھے۔ بوڑھے نے آوازہ کسنے والے کو گھور کر دیکھا، پھر غیر ملکیوں کی طرح کندھے اُچکائے اور پھر اپنے ساتھ والے سے بولا: "دیکھا نہیں کیا لکھا ہے۔ ہے ایں؟ دیکھو، ذرا دیکھو۔" "جاپان کا واحد فقیر جو تقریریں کرتا ہے" اور دیکھو یہ کیا لکھا ہوا ہے۔ "ایک ہارے ہوئے ملک کی مخلوق۔ گندی نالی کا بادشاہ۔" دیکھا! کچھ آیا سمجھ میں؟"

تختیوں پر اور بھی کئی تحریریں تھیں جو یہاں حوالہ کے لئے نقل کی جاتی ہیں اور اُن کا انگریزی میں ترجمہ جس کے معنی تھے:

"ہارے ہوئے جاپان کی سب سے بڑی تخلیق — اس ایک سپاہی کو دیکھئے۔"

اتنا تو بڑے بڑے سیاہ حروف میں تھا۔ باقی ایک تحریر میں تھا جو پورے تختے کو گھیرے تھا۔ دو فیٹ مربع تختہ اس تحریر سے بھرا ہوا تھا

"سنئے جناب، انسان کے وجود کی دردناک کہانی، جاپانی زبان و الزبان کی زبانی۔ اس انسان کا وجود جو ان راستوں سے گزرا ہے جو ہیں طوفانی۔ سنئے اس کے اپنے گیتوں کی راگنی۔ وہ اکیلا ہی بولتا ہے عوام کے اخلاق کا قصہ، مذہب کی داستان، فلسفہ کا افسانہ سناتا ہے . . ."

(ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر)

جنوبی افریقہ — ایلیکس لوگوما

کمبل

چوکر کی نیند ٹوٹی۔ عورت کے تار جیسے بال مُنہ میں چلے جانے سے باسی برٹن ٹائن کا مزہ اس کے منہ میں بھر گیا۔ اس نے اپنا جسم ہلایا تو پرانا دوہرا پلنگ لٹک کر بالکل جھول گیا۔ جہاں سر رکھے ہوئے تھا اس جگہ میلے تکیوں پر کالے نشان بن گئے تھے اور لپ اسٹک کی رگڑ کا ایک داغ نیم وا زخم کی طرح نظر آرہا تھا۔ رات کی شراب نوشی کی وجہ سے اس کا مُنہ سوکھ رہا تھا اور سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔

عورت کچھ نیم بیداری کی حالت میں لیٹی تھی۔ اس کا جسم کمبل کے نیچے پسینے سے تر اور چپچپا ہو رہا تھا اور بستر سے سستے عطر، بکھرے ہوئے پاؤڈر اور انسانی جسموں کی بو کے ساتھ بچے کے پیشاب کی ملی جلی بدبو بھی ہوا میں آرہی تھی۔ کھڑکی کے بدرنگ پردے اسے گرم ہوائیں بلا رہے تھے۔ صبح کی دھندلی روشنی میں پیتل کی ایک گھنڈی سے لٹکا ہوا ایک کپڑا اس کمرے میں بھوت کی مانند نظر آرہا تھا۔

چوکر خود کو بیمار اور چڑچڑا محسوس کر رہا تھا۔ میلے پرانے کمبل کی رگڑ اس کے چہرے پر لگی اور اس نے اور آتی ہوئی بوؤں کے ساتھ اسے سونگھا، اسے دھندلا سا خیال آیا کہ وہ ساری عمر ایسے ہی کمبلوں میں سوتا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کسی اچھے ہوٹل میں صاف دھلے ہوئے بستر پر سوئے اور پھر یہ خیال ٹھنڈی بیئر نہیں تو ٹھنڈا پانی پی لینے کی خواہش میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے کھسیا کر بستر کو اپنے اوپر سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔

عورت کمبل کے نیچے اس کی جانب مڑی اور نیم بیداری کے عالم میں بڑبڑانے لگی۔ چوکر گالی دیتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ پلنگ کی چرچراہٹ سے بچہ، جو فرش پر نہانے کے ایک تسلے میں سو رہا تھا، بیدار ہو گیا اور رونے لگا۔ اس کے بغیر دانتوں کے مُنہ سے نکلتی ہوئی آواز ایک تیکھی چیخ میں بدل گئی۔

چوکر پلنگ کی پٹی پر بیٹھا دل ہی دل میں بچے اور عورت کو گالیاں دے رہا تھا۔ اسے تعجب تھا کہ پہلے تو وہ کسی اور کی بیوی کے بستر میں داخل ہی کیسے ہوا اور دوسرے جب کہ اس عورت کے کمبخت ایک بچہ بھی تھا۔ بچہ ٹین کے تسلے میں پڑا چیخے جا رہا تھا۔

"اے!" وہ غصے اور جھنجلاہٹ میں اس بچہ پر چیخا۔

عورت نے جاگ کر اُس کی طرف دیکھا۔ مجبوراً میلے تکئے سے سر اٹھا کر اس نے جھڑک کر کہا "تم اتنی تیز آواز میں چلائے کہ بچہ جاگ گیا۔"

"اے، تو اپنا مُنہ بند رکھ" چوکر نے اسے غصّے میں کہا۔ "اٹھ اور اپنے چھوکرے کو سنبھال۔" وہ اٹھا اور بستر کا چکر کاٹ کر اپنی قمیص اور پتلون تلاش کرنے لگا۔

عورت نے سوال کیا "تم جا رہے ہو؟"

"بیشک، تمہارا خیال تھا کہ میں اس چلاّہٹ کو سُننا پسند کروں گا؟"

"اچھا!" عورت نے دکھائی سے جواب دیا "میں اسے کیا کر سکتی ہوں؟ تم کو معلوم تھا کہ میرے ایک بچہ ہے۔"

بچہ ابھی تک روئے جا رہا تھا۔ چوکر نے اس کی جانب دیکھا اور اپنی پتلون چڑھا کر قمیص کے بٹن لگائے۔ "بچے لعنت ہیں۔"

عورت نے نرمی سے پوچھا "تم واپس آؤ گے؟"

"ہاں ہو سکتا ہے، نہیں بھی ہو سکتا، میں نہیں جانتا۔"

"سنو!" عورت نے کہا "جب تم یہاں آؤ تو احتیاط رکھنا۔ میں نہیں چاہتی ک

میرا خاوند تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھے۔ اسے شک ہو گیا ہے کہ تم یہاں آتے ہو۔ وہ ضرور تمہارے ساتھ کچھ کرے گا۔"

چوکر نے اسی حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ "وہ؟ قسم سے میں اس کے جسم کے دو ٹکڑے اپنے ان خالی ہاتھوں سے کر دوں گا۔"

کمرہ میں آکر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ وہ مضبوط جسامت کا مرد تھا اور اس کے بازوؤں کی مچھلیاں فولاد کے تاروں کی طرح ابھری ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ بڑے بڑے تھے۔ وہ بہت بد معاش قسم کا آدمی تھا، اپنے ڈھیلے اور میلے ہاتھوں سے کوئی کام کرنے کی بجائے اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں لطف اٹھاتا تھا۔

عورت بولی "ٹھیک ہے۔ حالانکہ وہ مجھے چھوڑ چکا ہے لیکن وہ کسی دوسرے مرد کا یہاں آنا جانا پسند نہیں کرتا۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تم پر نظر رکھ رہا ہو۔"

"جہنم میں جائے وہ۔۔۔" چوکر غرایا "اس کی ماں۔۔۔"

عورت کچھ بولی نہیں اور بچے کو اٹھانے کے لئے چڑچڑاتے ہوئے پلنگ سے اُٹھ آئی اور اپنا ڈھیلا سا کوٹ پہنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر بچے کو دودھ پلانے لگی۔

وہ بولی "تم اگر تھوڑا انتظار کر لو تو میں تھوڑی سی چائے بنا دوں گی۔"

"رہنے دے۔"

چوکر نے اس کی طرف دیکھا، ناک چڑھائی اور سر ہلا کر باہر نکل گیا۔ وہ مکان کے گلیارے سے نکل کر دوسرے کمروں کے آگے سے نکل گیا۔ سر میں درد ہونے کی وجہ سے وہ بہت جھنجلایا ہوا تھا اور اس کا منہ اور حلق دونوں ہی سوکھے ہوئے تھے۔ فرش کے تختوں میں سوراخ تھے جو اس کے مضبوط جسم کے لئے مناسب نہ تھا اس لئے وہ نہایت ہوشیاری سے چل رہا تھا۔

صبح کی دھوپ میں اُس بدبودار مکان سے باہر نکل کر وہ نل کی طرف بڑھا جو ایک سوکھے گڑھے میں لگا ہوا تھا، کسی زمانہ میں اس جگہ ایک باغ ہوا کرتا تھا۔ اس نے جھک کر پیاس بجھائی منہ

دھویا اور اپنی قمیص کی آستینوں سے منہ صاف کیا۔ اس نے سوچا۔ "وہ عورت جہنم میں جائے میں وہاں اگر دوبارہ گیا تو پھنس جاؤں گا۔"

اس کے چاروں طرف پرانے گھنے بسے ہوئے مکانات کی ایک لمبی قطار تھی اور گندی بستیاں جو ٹین اور گتوں کی کمزور جھونپڑیوں کی شکل میں تعمیر کی گئی تھیں۔ مرغی کے بچے اور کتے گھاس پر گھوم رہے تھے۔ وہ ٹوٹی سڑکوں اور راستوں پر بغیر کسی مقصد کے بڑھ رہا تھا۔ لوگ اس سے کترا کر نکل جاتے یا غیر معمولی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ جاتے کیونکہ وہ لوگ اس کی حرکات سے واقف تھے۔ وہ ایک تیرتے ہوئے سمندری جہاز کی مانند تھا جو سڑتی ہوئی لاشوں کے لئے ہوئے سمندر کے درمیان چلا جا رہا ہو۔

جب چو کر ایک چار دیواری سے گھرے احاطہ سے گزر رہا تھا، تین آدمی تیزی سے اس کے عقب کے پھاٹک سے نکلے۔ ان میں سے ایک چلایا۔ "یہی ہے وہ!" اور اس سے قبل کہ وہ حالات کو سمجھتا تیز گرم بلم اس کے جسم کو چھو گئے۔ اس نے سر اور جسم میں شدید قسم کا درد محسوس کیا اور گر کر گالیاں بکنے لگا۔ وہ لوگ نہ تو اسے دیکھنے کو رکے اور نہ ہی دوبارہ مارنے کی زحمت اٹھائی بلکہ اس کے فولادی پنجوں سے بچ کر پھرتی سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ تنہا سڑک کو خون سے رنگتا رہا۔

چو کر سڑک پر پڑا تھا اور درد اور بہتے ہوئے خون کو اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ اٹھنا چاہتا تھا، لیکن اچانک ہی اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور اس کے ہاتھ اس کے جسم کا وزن نہ سنبھال سکے۔ وہ اسی جگہ پڑا رہا۔ اس کا پھڑکتا ہوا دماغ حملہ آوروں کو گالیاں دئے جا رہا تھا۔ وہاں مجمع لگنا شروع ہو گیا اور ہر شخص نہایت جوش میں آ کر بول رہا تھا۔

کسی نے کہا۔ "بہتر یہ ہو گا کہ اسے سڑک پر سے اٹھا لیا جائے۔"

"میں اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن یہ یہاں پڑا نہیں رہ سکتا۔"

"زیادہ بہتر ہو گا اگر سامنے کی دوکان میں جا کر ایمبولنس کے لئے فون کر دیا جائے۔"

"اچھا! کیا تم نے انھیں دیکھا تھا؟"

"دیکھو دوست، میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا اسے اٹھاؤ۔ دیکھو فریڈی تم اس کے پیر پکڑو، ڈیمپی اس کی مدد کرو۔ میں اور لوئی لسٹی اس کو بازوؤں سے اٹھاتے ہیں۔"

وہاں پڑے ہوئے خون میں لت پت اور بےچین چوکرنے سب ہی کو دل ہی دل میں گالی دی۔ تب ہی اس نے اپنے کو نہایت بےرحمی سے اٹھائے جاتے ہوئے محسوس کیا۔ اُس نے سوچا یہ اچانک کمزور ہو جانے پر بھی لعنت ہے۔ وہ اسے لادے ہوئے تھے اور وہ انھیں گالیاں دے رہا تھا۔ ان میں سے ایک مسکرا کر بولا "قسم سے یہ اصلی قسم کا غنڈہ ہے۔"

چوکر عقب کے ایک سائبان کے فرش پر لیٹا تھا جہاں وہ لوگ اسے لٹا گئے تھے۔ اُس جھکی ہوئی چھت کے نیچے ٹھنڈک تھی۔ ایک کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ایک پرانا موٹر کا ٹائر، پرانے ٹوٹے پھوٹے بکس، ایک پرانا نمیل سجانے کا بورڈ جس پر سے روغن اڑ جانے کی وجہ سے کسی دوسرے سیاروں کے نقشوں کی طرح دھبّے ابھرے ہوئے تھے۔ اور ایک پلنگ کا پایا جو دھول میں بھرا ہوا تھا۔ اس سائبان میں چوہوں کی بیٹ اور گندگی کی بدبو بھی تھی۔

باہر پیلے زنگ کے سورج کے اس پار سے چخ چخ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ احاطہ میں وہ سب لوگ اسی بات کا ذکر کر رہے تھے۔ چوکر نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنے جسم کی لمبائی کے اُس پار اپنے میلے اور ننگے پیروں کی انگلیوں کے اندر جھانکنے لگا۔ اسے کئی عورتوں اور مردوں کے جوڑے نظر آئے جن کی ٹانگیں پھٹی پتلونوں اور اُدھڑی ہوئی جرابوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔

ایک شخص کہہ رہا تھا "یہ بزدلی تھی کہ پیچھے سے۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں، لیکن اس نے دوسروں کے ساتھ کیا کیا ہے؟ یہ بھی تو دیکھو۔ میں پہلے ہی نہ کہتا تھا؟"

چوکر نے سوچا کہ یہ دو غلے جہنم میں جائیں۔ سب کے سب جہنم میں جائیں۔ کسی نے ایک پرانا کمبل اس کے جسم پر ڈال دیا تھا۔ اس میں سے پسینے، گرد اور گندے اور غلیظ جسموں کی بدبو آ رہی تھی۔

وہ کمبل پھٹا ہوا اور نہایت گندہ تھا اور اس میں جگہ جگہ سوراخ بھی تھے۔ اُس نے اپنی موٹی انگلیوں سے اسے چھوا۔ اس کا کپڑا کھردرا تھا اور جہاں جہاں سے گھس گیا تھا وہاں پتلا اور چمکدار نظر آتا تھا۔ لیکن وہ ایسے کمبلوں کو استعمال کرنے کا عادی تھا۔

چوکر کو تین بار چھرا مارا گیا تھا۔ پہلی بار اس کے سر میں، دوسری مرتبہ اس کے شانے کی ہڈیوں میں اور تیسری دفعہ داہنی بغل میں — اب خون بہنا بند ہو چکا تھا اور درد میں بھی شدت نہیں رہی تھی۔ اس کو اس سے قبل بھی چاقو سے مارا گیا تھا مگر اتنی بری طرح کبھی نہیں جیسا کہ اس بار۔ اس نے درد کی غنودگی میں سوچا۔ یہ آوارہ ایک اچھا کام بھی نہ کر سکے۔ وہ وہاں پڑا ہوا ایمبولنس کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے تانبے جیسے چہرے کے پاس خون دھیرے دھیرے سوکھنے لگا تھا اور اس کے سر میں بری طرح درد ہو رہا تھا۔

آوازیں، جو کبھی کبھی اونچی ہنسی میں بدل جاتی تھیں، باہر چہک رہی تھیں اور کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ احاطے کے سخت فرش پر پیروں کے چلنے کی آواز آ رہی تھی اور بھورے رنگ کے ایک کتے جیسی شکل نے اندر جھانکا جو ایک گھسے ہوئے کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

"تم ٹھیک ہو نہ چوکر؟ ایمبولنس ابھی آ رہی ہے۔ ایں؟"

"بھاگ جاؤ۔" چوکر نے کہا۔ اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔

ہنستے ہوئے وہ آواز دور ہوتی گئی۔ "اوئے چوکر، اوئے چوکر۔"

دوسری آواز نے کہا "وہ کافی دیر سے اس کی تاک میں تھا۔"

"ہاں! لیکن چوکر بھی اچھا چاقو باز نہیں رہا۔ یہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے ہی کام لیتا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں یہ بھی بری بات ہے۔"

"جہنم میں جائیں۔" چوکر نے سوچا۔ وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ زنگ آلودہ

فولادی پنجے کی طرح سخت اس کی انگلیاں کمبل کے سوکھے حصّوں پر چل رہی تھیں ... اب وہ ایک گیلے "تارکول سے بنے ہوئے آنگن میں لے جایا جا رہا تھا جہاں کی کھڑکیوں میں مضبوط تاروں کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس جگہ سے کاربولک اور کیڑے مکوڑے مارنے کی دواؤں کی بو آرہی تھی اور گارڈ کی انگلیوں میں لٹکا ہوا بھاری کنجیوں کا گچھا کھنکھنا رہا تھا۔

وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچا کہ جہاں بہت سے خانوں میں کمبل رکھے ہوئے تھے۔ "اب دو اٹھا لے" گارڈ نے کہا۔ اور چوہڑ ان ڈھیروں میں سب سے موٹے اور گرم کمبل تلاش کرنے لگا۔ لیکن گارڈ نے، جس کا چہرہ کچھ کچھ بھوسے کے سے ملتا جلتا تھا اور جو پھٹی ہوئی ٹوپی پہنے تھا، ہنس کر اس کو الگ کر دیا اور پاس پڑے کمبلوں میں سے دو کمبل اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیئے۔ وہ کمبل گندے اور بدبودار تھے اور ان کی تہوں میں پسّو اور کھٹمل ایسے کلبلا رہے تھے جیسے فوجی اپنے دشمنوں کی تاک میں رہتے ہیں۔

"چلو چلو! تمہارا خیال ہے کہ میرے پاس فالتو وقت ہے؟"

"بہت سردی ہے۔" چوہڑ نے کہا۔

لیکن چوہڑ یہ بات گارڈ سے نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ جب چھ سال کا تھا تب وہ اور اس کا ایک بڑا بھائی، جو عمر میں اس سے ایک سال بڑا تھا ایک ہی پلنگ میں سوتے تھے، سکڑے ہوئے کروٹیں بدل رہے تھے۔ دلّی نے پتلا سوتی کمبل چوہڑ کے جسم پر سے کھینچ لیا تھا۔ باہر بارش گتے سے بند کھڑکیوں سے ٹکرا رہی تھی اور اس کے جسم سے ہوا ایسے گزر رہی تھی جیسے دمے کا کوئی مریض جلدی جلدی سانسیں لے رہا ہو۔

"نہیں نہیں، دلّی، تونے سارا کمبل کھینچ لیا ہے بے۔"

"ہاں، مگر میں کچھ نہیں جانتا، بہت سخت سردی ہے۔"

"میرا کیا ہوگا؟" چوکر منمنایا۔ "میرا کیا ہوگا؟ مجھے بھی سردی لگ رہی ہے۔"
کمبل کے اندر وہ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے لیٹے رہے اور وہ لوگ اس میں کچھ تصویروں کے ٹکڑے نظر آرہے تھے۔۔۔ عورت کے تار جیسے بال اس کے منہ میں جانے سے باسی تیل کی بو اس کے منہ میں گھس گئی۔ میلے تکیئے پر سروں سے کالے داغ بن گئے تھے اور نیم دا زخم کی مانند لپ اسٹک کی رگڑ کا ایک داغ تھا۔

عورت کچی نیند میں کہہ رہی تھی "تم نے دیکھا؟ تم نے دیکھا؟ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟" کمبل کے نیچے اس کا جسم پسینے سے بھیگا ہوا اور چپچپا رہا تھا۔ کمبل اور بستر سے سستے عطر بھرے پاؤڈر، پیشاب اور بیٹ کی بدبو آرہی تھی۔ بدرنگ پردے ایسے گرم ہوا میں ہلا رہے تھے۔ عورت نے کمبل کے اندر اس کی طرف سے کروٹ بدلی، بڑبڑائی اور چوکر اٹھ بیٹھا۔ پلنگ کی تکلیف دہ چرچراہٹ سے فرش پر ٹین کے تسلے میں سویا ہوا بچہ جاگ پڑا اور اپنی تیکھی کھنکدار آواز میں چیخنے لگا اور اس کی یہ چیخ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔۔۔۔

وہ چیخ بلند ہو کر ایک دم رک گئی کیونکہ سائرن بلند ہوگیا تھا، چوکر کی بے ہوشی ختم ہو چلی تھی۔

زور زور سے بولنے کی آوازیں احاطے میں سورج کی کرنوں سے ٹکرا کر آرہی تھیں۔ چوکر نے سفید لوگوں کے گھیرے دیکھے اور تب ہی ایمبولنس والے اس سائبان میں آگئے۔ اس کا سر بری طرح درد کر رہا تھا اور اس کے زخموں میں کھڑکھڑاہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے ایسا بھیگا ہوا تھا جیسے کسی نے دھلے ہوئے کپڑے کو اس کے چہرے پر نچوڑ دیا ہو۔

ہاتھ اس کے جسم کو ٹٹول رہے تھے۔ ایمبولنس کے ایک شخص نے پوچھا "کیا کوئی درد محسوس ہو رہا ہے؟"

چوکر نے اپنے اوپر جھکے ہوئے گلابی چہرے کو دیکھا اور غصّے میں بولا "نہیں جناب!"
پرانے اخباروں کی تہیں، جن پر وہ لیٹا ہوا تھا، اس کے خون سے تر تھیں۔ "چاقو کے

زخم؟" ایک اور ڈاکٹر نے دریافت کیا۔ "خون زیادہ نہیں بہہ رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا: "دو پریشر پیڈ رکھ دو۔"

وہ عجیب الجھن میں تھا۔ اسٹریچر پر لیٹا ہوا اور تماش بینوں کا جلوس اس کے دونوں طرف تھا۔ اس کی پیٹھ کے نیچے ربر کی چادر اسے ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔ اسٹریچر کو جلدی سے ایمبولنس میں لے جا کر دروازے بند کر لئے گئے اور باقی لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اسی وقت سائرن بج اٹھا اور تیز ہوتا گیا۔

چو لمرنے تیزی سے دوڑتی ہوئی ایمبولنس کی رفتار کو اپنے جسم کے ہلنے سے محسوس کیا۔ اس کی خونی انگلیوں نے بستر کے مڑے ہوئے کناروں کو چھوا۔ اس کے اوپر پڑی ہوئی چادر کفن کی طرح سفید تھی اور مبل موٹا، نیا اور گرم تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹ کر ایمبولنس کے سائرن کو سننے لگا۔

(ترجمہ: جعفر عباس)

جنوبی ویت نام　　　　　　　　　تھوئی تو

ننھی کھڑاؤں

نومبر ۱۹۶۰ء میں نگو دن دیم پر جو حملہ ہوا تھا اس میں سیکنڈ لفٹننٹ تھی تران نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس کا عرف تھوئی تو تھا اور وہ اس وقت جنوبی ویتنامی حکومت کی فوج میں تھا، بعد کو گوریلوں کی صف میں شامل ہو گیا اس نے امریکی شہنشاہیت پسندوں اور ان کے پٹھوؤں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی بڑی دردناک داستانیں قلم بند کی ہیں۔ (یہ کہانی اس کے مجموعے "ایک ہزار ایک افسانے" میں سے لی گئی ہے)

میں شمالی ویت نام میں پیدا ہوا تھا، جنوبی ویت نام کو تو صرف ۱۹۵۴ء سے جانتا ہوں۔ جبکہ میں ایک جہاز میں ٹھونس کر جنوبی ویت نام بھیجا گیا میرے سب خاندان والے بھی اسی میں تھے۔ کاش کہ میں نے اسی وقت سوچا ہوتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں کہاں جا رہا ہوں، کاش کہ میں کبھی اِدھر نہ آیا ہوتا لیکن ایسا کیوں سوچا جائے۔ جنوبی ویت نام تو ایک ایسی دھرتی ہے جو زندگی سے بھرپور ہے۔ کتنے رسیلے آم یہاں ہوتے ہیں، آسمان کیسا نیلا، روشن دھوپ اور ہوا سے رچا ہوا۔ لوگ کتنے محبت کرنے والے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت کس قدر دلکش —— اور دریا! آہ، دریا!

گزرا ہوا یہ، دریا کے ذکر پر مجھے اپنی زندگی کے واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔ میں جھونپڑے کے باہر کھڑا تھا۔ آسمان پر کالی رات چھائی تھی۔ ستارے، جھلملاتے، ڈبک ڈبک

کرتے، ستاروں سے جڑی ہوئی کالی رات — میرے سامنے دریا بہتا ہی جا رہا تھا۔ اُس کی تیز موجیں ایک کے بعد ایک چڑھتی ہی چلی آتی تھیں۔ اس پار پھلوں کے باغ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اُس پار ایک اُجاڑ جھونپڑا تھا۔ جزیرے کے بالکل کنارے پر۔ اور اُس کے آس پاس جھاڑیاں تھیں۔ پھر جھونپڑے کے بوڑھے مالک کی کھانسی سنائی دی اور اُس کے پاس سے اُس کے ننھے پوتے کے رونے کی آواز آئی۔ جھونپڑے کے ہلتے، چرچراتے دروازے کی دراڑ سے پیرافین تیل کے چراغ کی روشنی ایک لکیر کی طرح باہر پڑ رہی تھی — باہر جہاں زمین اونچی اور اوبڑ کھابڑ تھی، اور مجھے یاد آیا کہ اس بوڑھے اور اُس کے پوتے نے کیسی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ میں آج بھی اُن نگاہوں کو یاد کرتا ہوں تو سہم جاتا ہوں۔ دل بیٹھنے لگتا ہے !

اس علاقے میں گوریلے بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے اور مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہاں کسی پر بھروسہ نہ کرنا۔ شاید بوڑھے کا جوان بیٹا اور اس کی بیوی بھی گوریلوں میں شامل ہو گئی تھی۔ شاید ننھا پوتا اسی لئے دادا کے حوالے کر دیا گیا تھا کہ اور کوئی اُسے سنبھالنے والا نہ تھا یا ہو سکتا ہے اس کے ماں باپ بمباری میں مر گئے ہوں۔ کون جانے —! اچھا اگر وہ گوریلوں میں شامل ہو گئے تھے تو کیوں؟ کیا انہیں کسی عزیز کے خون کا بدلہ لینا تھا یا شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کا بچہ اس ماحول میں بڑا نہ ہو جہاں زبردستی محنت لی جاتی تھی، جہاں کمر توڑ ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ شاید وہ نوجوان یہ نہیں چاہتا تھا کہ امریکی فوجوں اور ان کے ویتنامی پٹھوؤں کے ہاتھ اس کے بوڑھے باپ کی جان چلی جائے — اسی لئے وہ کلہاڑی یا خنجر لیکر جنگلوں میں چھپ گیا تھا۔ اس کے اس طرح گھر چھوڑ کر چلے جانے کے بہت سے سبب ہو سکتے تھے۔ جہاں تک میرا سوال تھا، میں اپنی اس فوجی وردی کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا تھا جو سات برس سے مجھے بلا کی طرح چمٹی ہوئی تھی۔ جب میں طالب علم تھا تو جنوبی حکومت کے جاسوس مجھے گھیرے رہتے تھے۔ اب بھی ان کا لفٹننٹ بن جانے کے باوجود جب میں نظر اٹھاتا تھا، شک اور جبر کی پرچھائیاں

مجھے چاروں طرف دکھائی دیتی تھی ــــ انھیں ایسے کسی سپاہی پر بھروسہ نہ تھا۔ گھر جاتا تو ماں باپ کی پریشان حالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ روزگار چلتا نہ تھا۔ ٹیکس بڑھ رہے تھے۔ میرے پانچ چھ قریبی دوستوں میں سے کچھ گرفتار ہوگئے تھے کچھ کو "از سر نو تعلیم" دینے کے لئے کیمپوں میں بھیجدیا گیا تھا۔ سڑکوں پر امریکن فوں فوں کرتے پھرتے تھے۔ مجھے ان کی رنگین قمیصوں اور اُن کے "او۔ کے" سے نفرت محسوس ہوتی تھی اور اپنے فوجی لباس پر شرم آتی تھی۔ کیوں میں نے یہ لباس اپنے وجود پر چپکنے دیا؟ صرف تنخواہ کی خاطر؟ کیا میں بک گیا تھا؟ ہم سے کہا جاتا تھا کہ ہم آزادی کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ہم کمیونزم سے لڑ رہے ہیں۔ وہ کیا آزادی تھی جس کی ہم حفاظت کر رہے تھے۔ وہی آزادی جس کے لئے حکومت لوگوں کو لوٹ رہی تھی۔ لوگوں کی جانوں اور عزتوں سے کھیل رہی تھی۔ کمیونسٹوں کو ایسی حرکتیں کرتے میں نے تو نہیں دیکھا تھا ــــ پھر آزادی کس طرف تھی؟ انصاف کدھر تھا۔ یقیناً اس طرف تو نہیں تھا جدھر میں تھا۔ میرے پڑوسی دا امپ نے کیوں اپنے کو زندہ جلا کر خاک سیاہ کر لیا تھا۔ اگر وہ آزادی، انصاف اور برابری کے سماج میں رہ رہا تھا؟

صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ایک ناریل کے درخت کے پاس کھڑا ہوں۔ ایک پلٹن قریب ڈیرہ ڈال رہی تھی اور دو پلٹنیں گاؤں میں تلاشی لینے گئی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف بھیانک سناٹا تھا۔ کوئی نظر نہ آتا تھا، بس میں تھا یا سپاہی تھے

پھر تھوڑی دیر بعد تراگ آیا جو میرا کمپنی کمانڈر تھا۔ اس کے تمام بدن میں کیچڑ چپٹا ہوا تھا، بولا۔ "ان بدمعاشوں کی وجہ سے مجھے کئی نہروں سے ہل کے ہمکنا پڑا"۔ میں نے اس کی اٹھی ہوئی انگلی کی طرف نگاہ اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی دس عدد مرد و عورتیں ہیں۔ بوڑھے بھی ان میں دو بچے بھی ہیں جو گیارہ بارہ سال کے رہے ہوں گے۔ ان کے چہرے خوف کے مارے ستے ہوئے تھے اور اُن کے سیاہ سوتی کپڑوں پر کیچڑ سفید سفید لگتی تھی۔ ان میں سے ایک بوڑھا آدمی جو کپڑے پہنے تھا وہ شائد کبھی سفید رہے ہوں مگر اب نہر کی کیچڑ سے بالکل

مٹیالے ہو گئے تھے۔

میں کمپنی کمانڈر کے پیچھے پیچھے جھونپڑے میں گھسا، چھوٹے سے آنگن کے بیچوں بیچ کوٹھریوں کے سامنے، گولے گرنے سے ایک گڈھا ہو گیا تھا۔ آنگن میں ادھر اُدھر کچھ چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اندر صرف بانس کی دو چار پائیاں تھیں۔ دیوار پر ایک مچھلی پکڑنے کا جال لٹکا ہوا تھا جو کسی طرح کی چھال سے رنگا گیا ہوگا مگر اس وقت تو اس پر کیچڑ، پانی اور پسینے کے ملے جلے رنگ چھائے تھے۔ عبادت کا دیوٹ نیچے گر پڑا تھا۔ اس کے پاس ہی کھمبے کی آڑ میں لوبان جلانے کا ایک ٹوٹا پیالہ پڑا تھا۔ ایک پھٹی پرانی میلی کچیلی مچھر دانی ایک بانس پر لٹک رہی تھی جو کونے میں سیدھا کھڑا تھا۔

سپاہی چیزوں کو اٹھانے دھرنے لگے۔ میں ادھر اُدھر گھومتے ہوئے سوچنے لگا کہ کیسے لوگ تھے جو حملے سے پہلے یہاں رہتے تھے۔ جھونپڑے کو کھمبوں کی دیواروں سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک میں شاید پکڑی ہوئی مچھلیاں صاف کی جاتی تھیں۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کے پاس ماہی تو ادہ رہا ہو۔ مسالے رکھنے کی مٹی کی مرتبانیاں رہی ہوں۔ ان کے پاس کالے سوتی کپڑے رہے ہوں۔ اُن کے خاندان میں غالباً باپ تھا، ماں تھی اور ایک ....

یکایک میری نظر ایک چھوٹی سی لکڑی کی کھڑاؤں پر پڑی جو کھمبوں کی دیوار کے پاس پڑی تھی۔ جھک کر میں نے اسے اٹھالیا۔ وہ کسی ننھی سی بچی کی کھڑاؤں تھی۔ اس میں سفید پلاسٹک کا پٹہ لگا ہوا تھا اور لکڑی بہت ہلکی تھی ــــ کیسی منی سی تھی وہ کھڑاؤں! میری ہتھیلی سے زیادہ لمبی نہ تھی اور کتنے پیارے گلابی رنگ سے رنگی ہوئی، جیسے جھینگوں کے رنگ کا گلابی پن کہتے ہیں! ہاں اسے جھینگا گلابی ہی تو کہتے ہیں غالباً ــــ ویسے مجھے اس معاملے میں کوئی زیادہ معلومات نہیں۔ گلابی رنگ پر رنگ برنگے پھول پینٹ کئے ہوئے تھے۔ میں نے ایسی کھڑاویں دیہاتی میلوں میں دیکھی ہیں جہاں سے بچیاں انھیں بڑے شوق سے خریدتی ہیں اور پہننے سے پہلے اپنی منی منی انگلیوں میں لٹکا کے گھماتی ہیں۔ اور میں سوچنے لگا کہ ننھے ننھے تلووں والی وہ

بچی کیسی رہی ہوگی جس کی یہ کھڑاؤں ہے۔ زیادہ سے زیادہ چھ سال کی رہی ہوگی، گلابی ایڑیاں۔ سیاہ بھونرالے بال۔ چھینٹ کی جاکٹ پہنے جس پر طرح طرح کے رنگین پھول رہے ہوں گے۔

کھڑاؤں بالکل نئی تھی۔ شاید بچی نے اسے تیرتھ کے میلے میں پہننے کے لئے سنبھال کے رکھا ہوگا۔ پھر گولیاں برسنے لگیں۔ گھروں میں آگ لگی اور شعلوں کے ساتھ ساتھ فوجیں داخل ہوئیں۔ اس فوج میں میں بھی تھا۔ پھر بندوقیں دغنے لگیں، لوگ مرنے لگے، خوف سے سہم کر وہ اپنی ماں سے لپٹی پلنگ کے نیچے گھس گئی۔ اور پھر..... اور پھر — آہ میری ننھی سی بچی، تو یہ اپنی ایک کھڑاؤں کیسے چھوڑ گئی۔ مجھ بدبخت کے دل سے بس ایک ہی دعا نکلتی ہے کہ تو بچ گئی ہو۔ تو زندہ سلامت ہو۔ تجھے کچھ نہ ہوا ہو۔ کتنا اچھا ہوا کہ تو نکل گئی ورنہ یہ درندے تو نہ تجھ کو چھوڑتے نہ تیری ماں کو۔ ان کی ہی بندوقوں نے تو تجھے اتنا دہلا دیا کہ تو اپنی کھڑاویں لیکر دوڑی تو سہی پر گھبراہٹ میں ایک کھڑاؤں تیری ننھی سی مٹھی میں سے چھٹ گئی۔ کیسی ظالم ہیں یہ بندوقیں جنھوں نے تیری معصوم آنکھوں کی وہ روشنی چھین لی جن میں سرسبز پتوں کا عکس لہکا کرتا تھا۔ یہ سپاہی ہیں بھلا جنھوں نے تیرے بھولے بھالے دل کی ساری امنگیں کچل ڈالیں، اور ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا — لعنت ہو تجھ پر! میری ننھی معصوم نہیں، میری بچی، تیری پھٹکار ہو مجھ پر!

میں نے باہر نکل کر پوچھا "لفٹننٹ کہاں ہے؟"

"وہاں" ایک سپاہی نے دور ایک جھونپڑے کی طرف اشارہ کیا جو پھلوں کے درختوں

بیچ میں چھپا ہوا تھا۔

"کیا کر رہا ہے؟"

"پتہ نہیں — شاید کسی سے کچھ قبولوا رہا ہے۔"

"میں جھونپڑے تک پہونچا ہی تھا کہ اندر سے گالیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ کیسی

کمانڈر کی آواز تھی۔ میں اندر گیا تو اس نے سر اٹھا کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟"

"میں آپ سے صرف یہ پوچھنے آیا تھا کہ بٹالین کو کچھ اور رپورٹ بھیجنی ہے؟"

"نہیں ابھی کچھ نہیں —— لاؤ سگریٹ دو۔"

میں نے چپ چاپ اپنی سگریٹ کی ڈبیا اس کے حوالے کر دی۔ اس نے سگریٹ جلایا اور کش لیا۔ پھر بولا —— "دیکھتے ہو اس بندریا کو —— یہ لوک کی بیوی ہے۔ اتنی دیر سے مغز کھپا رہا ہوں۔ پر یہ ہرگز قبول کے نہیں دے رہی ہے کہ لوک کہاں ہے؟ کم از کم اتنا ہی بتا دے کہ وہ کدھر گیا ہے، خیر کہاں تک نہ بتاوے گی۔" اور پھر وہ زور زور سے گالیاں بکنے لگا۔

میں باہر نکل گیا اور گاؤں کے سرے تک جا پہونچا، وہاں ہی ایک چوکی تھی۔ سپاہی بیٹھے کھانے سے پہلے کچھ بطخیں صاف کر رہے تھے۔ چوکی کا پہرہ دار اٹھ کر میری طرف آیا۔

"یہ سب جھونپڑے خالی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی جناب۔"

میں اور آگے بڑھ گیا اور سوچنے لگا کہ سپاہیوں کو یہ بطخیں کہاں سے ملیں۔ میلے شفاف آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے، ابھی ابھی کے کٹے ہوئے کھیتوں میں کھونٹیاں تازی اور ہری دکھائی دے رہی تھیں —— موت! آہ۔ موت کتنی بھیانک چیز ہے۔

پھر دور کسی گاؤں میں توپیں چلنے کی آواز آنے لگی، میں نے گولیوں کی آگ دیکھی، بارود کی چنگاریاں۔ کیا اس گاؤں میں بھی کوئی ننھی کھڑاؤں چھوٹ گئی تھی؟ پھر گھروں میں لگتی آگ نظر آنے لگی۔ دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے۔ سبز سبز جھاڑیوں میں دوڑتے ہوئے سپاہی جن کی ٹوپیوں میں گھاسیں بندھی ہوئی تھیں، ایسے خوبصورت دن میں بھی انسانوں کو جان سے مارا جا سکتا تھا؟

پھر گولیوں کی آوازیں بند ہو گئیں —— میں کمپنی کمانڈر کے جھونپڑے کی طرف واپس

ہوا۔ جیسے میں نے قدم اندر رکھا، شراب کا ایک بھبکا آیا۔ وہ نشہ میں دھت ہو رہا تھا
میں اندر بھی آ گیا لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اسی عورت پر گرجتا رہا۔
"تو تو نہیں بولے گی، ایں!"

وہ نوجوان عورت زمین پر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ آنکھیں
خوف کے مارے ابلی پڑ رہی تھیں۔

"بول!" کپتن کمانڈر چیخا...... اور پھر اس نے ایک ظالمانہ قہقہہ لگایا۔ عورت
پیوند لگا ہوا بلاؤز کھینچا اور اسے تار تار کر دیا۔ عورت نے بے بسی سے گردن ادھر ادھر ہلائی
ناگن کی طرح پھنکاری "بدمعاش، کمینہ!"

وہ گھوڑے کی طرح دانت نکالے ہنستا رہا۔ میں نے سوچا، غریب عورت! شاید
اس کے بھی کوئی ننھی سی بچی ہو، جس کے لئے اس نے گلابی پھولدار کھڑاؤں خریدی ہو۔۔۔ پھر میں
کپتن کمانڈر کی طرف دیکھا۔ وہ اس نوجوان عورت کے کپڑے پھاڑتا ہی جا رہا تھا اور کپڑا
پھٹنے کی آواز کے ساتھ اس کے قہقہے بلند ہوتے جا رہے تھے اور مجھے ایسا نظر آ رہا تھا جیسے
کوئی جنگلی درندہ بس اپنے شکار کو کھانے ہی والا ہو۔ اس منظر کو دیکھ کر یکایک مجھ پر ایک
جنونی کیفیت طاری ہوئی، جیسے میں بالکل پاگل ہو گیا۔ پلک جھپکتے میں نے کندھے سے بندوق
اتاری۔ اس کی نال کو کس کر دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور دستے سے اس کی گدی پر ایک وار کیا
۔۔۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا، چند لمحوں میں بے شمار وار کئے۔۔۔ عورت لوٹ پوٹ کر دوسری
طرف سرک گئی اور حیران نظروں سے دیکھنے لگی، یہ جو کچھ ہو رہا تھا کہ وہ سب کیا تھا۔ پھر
کپتن کمانڈر کرسی سے پھسل کر زمین پر ڈھے پڑا۔ اور اس کا سر اس عورت کے پاؤں سے لگا جو
عریاں اور مجبور و بے بس بندھی پڑی تھی۔

میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پیر کھولے اور اسے پیچھے کی طرف بھاگ جانے کا
اشارہ کیا۔ پھر میں نے کپتن کمانڈر کے سر میں ایک ٹھوکر ماری۔ اس پر تھوکا۔ آہستہ آہستہ اطمینان

جلتا ہوا باہر نکل آیا، اور سامنے جس گاؤں پر گولہ باری ہو رہی تھی اس کی طرف چلنے لگا۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ سپاہی مجھ کو پہچانتے تھے وہ مجھ سے کچھ نہیں بولے اور میں اس گاؤں کی طرف بڑھتا گیا جس پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ ضرور اس گاؤں میں بھی بچے رہتے ہوں گے جن کی کھڑاویں چھوٹ گئی تھیں۔ ننھی، ننھی، گلابی پھولدار کھڑاویں۔ جو ان کی ماؤں نے تہوار کے واسطے ان کو میلے میں سے لیکر دی ہوں گی۔

پھر میں چاول کے کھیتوں کی سرحد پر پہونچ گیا۔ اور اب مجھے اپنے پیچھے بندوقوں اور مشین گنوں کی آواز آنے لگی — میں بے تحاشہ دوڑنے لگا — ابھی مجھے زندہ رہنا تھا ابھی مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ کیونکہ ان چھوٹے چھوٹے برباد جھونپڑوں کے آنگنوں میں گولوں نے گڑھے کر دیئے تھے اور بانس کی کھپچیوں والی دیواروں کی آڑ میں بہت سی ننھی ننھی گلابی پھولدار کھڑاویں بے یار ومددگار پڑی تھیں۔

(ترجمہ۔ رضیہ سجاد ظہیر)

ہوا۔ جیسے میں نے قدم اندر رکھا، شراب کا ایک بھبکا آیا۔ وہ نشے میں دھت ہو رہا تھا۔ میں اندر بھی آ گیا لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اسی عورت پر گرجتا رہا۔ "تو تو نہیں بولے گی، ایں!"

وہ نوجوان عورت زمین پر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ آنکھیں خوف کے مارے ابلی پڑ رہی تھیں۔

"بول!" کمپنی کمانڈر چیخا..... اور پھر اس نے ایک ظالمانہ قہقہہ لگایا۔ عورت پیوند لگا ہوا بلاؤز کھینچا اور اسے تار تار کر دیا۔ عورت نے بے بسی سے گردن ادھر ادھر ہلائی ناگن کی طرح پھنکاری ''بدمعاش، کمینہ!''

وہ گھوڑے کی طرح دانت نکالے ہنستا رہا۔ میں نے سوچا، غریب عورت! شاید اس کے بھی کوئی ننھی سی بچی ہو، جس کے لئے اس نے گلابی پھولدار کھڑاؤں خریدی ہو — پھر میں نے کمپنی کمانڈر کی طرف دیکھا۔ وہ اس نوجوان عورت کے کپڑے پھاڑتا ہی جا رہا تھا اور کپڑا پھٹنے کی آواز کے ساتھ اس کے قہقہے بلند ہوتے جا رہے تھے اور مجھے ایسا نظر آ رہا تھا جیسے کوئی جنگلی درندہ بس اپنے شکار کو کھانے ہی والا ہو۔ اس منظر کو دیکھ کر یکایک مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوئی، جیسے میں بالکل پاگل ہو گیا۔ پلک جھپکتے میں نے کندھے سے بندوق اتاری۔ اس کی نال کو کس کر دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور دستے سے اس کی گدی پر ایک وار کیا — پھر دوسرا، پھر تیسرا، چند لمحوں میں بے شمار وار کئے — عورت لوٹ پوٹ کر دوسری طرف سرک گئی اور حیران نظروں سے دیکھنے لگی، یہ جو کچھ ہو رہا تھا کہ وہ سب کیا تھا۔ پھر کمپنی کمانڈر کرسی سے پھسل کر زمین پر ڈھے پڑا۔ اور اس کا سر اس عورت کے پاؤں سے لگا جو عریاں اور مجبور و بے بس بندھی پڑی تھی۔

میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ پیر کھولے اور اسے پیچھے کی طرف بھاگ جانے کا اشارہ کیا، پھر میں نے کمپنی کمانڈر کے سر میں ایک ٹھوکر ماری۔ اس پر تھوکا۔ آہستہ آہستہ اطمینان

جلتا ہوا باہر نکل آیا، اور سامنے جس گاؤں پر گولہ باری ہو رہی تھی اس کی طرف چلنے لگا۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ سپاہی مجھ کو پہچانتے تھے وہ مجھ سے کچھ نہیں بولے اور میں اس گاؤں کی طرف بڑھتا گیا جس پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ ضرور اس گاؤں میں بھی بچے رہے ہوں گے جن کی کھڑاویں ٹوٹ گئی تھیں۔ ننھی، ننھی، گلابی پھولدار کھڑاویں۔ جو ان کی ماؤں نے تہوار کے واسطے ان کو میلے میں سے لیکر دی ہوں گی۔

پھر میں چاول کے کھیتوں کی سرحد پر پہونچ گیا۔ اور اب مجھے اپنے پیچھے بندوقوں اور مشین گنوں کی آواز آنے لگی — میں بے تحاشہ دوڑنے لگا — ابھی مجھے زندہ رہنا تھا ابھی مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا — کیونکہ ان چھوٹے چھوٹے برباد جھونپڑوں کے آنگنوں میں گولوں نے گڑھے کر دیئے تھے اور بانس کی کھپچیوں والی دیواروں کی آڑ میں بہت سی ننھی ننھی۔ گلابی پھولدار کھڑاویں بے یار و مددگار پڑی تھیں۔

(ترجمہ۔ رضیہ سجاد ظہیر)

چین

لہ سون

ایک واقعہ

مجھے دیہات سے دارالحکومت آئے ہوئے چھ برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں میں نے ریاست میں واقع ہونے والے اُن برائے نام امور کے بارے میں اتنا دیکھ اور سُن لیا ہے کہ اگر میں انھیں قلمبند کروں تو یہ پوری ایک کتاب بن جائے لیکن اس میں سے کسی بھی واقعہ نے مجھے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ ان کا مجھ پر کیا اثر ہے تو میں صرف یہی کہوں گا کہ ان واقعات نے میری بدمزاجی میں اضافہ کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے حد سے زیادہ خود پسند بنا دیا۔

بہرصورت ان میں سے ایک واقعہ مجھے بہت اہم محسوس ہوا جس نے مجھے میری بدمزاجی سے نجات دلائی اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ اس کو میں اس وقت بھی بھول نہیں سکتا۔

یہ ۱۹۱۷ء کے درمیانی جاڑوں کی بات ہے۔ سخت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن "روزگار" کے لیے مجھے سویرے اٹھنا اور باہر نکلنا پڑا — سڑک پر مشکل ہی سے کوئی شخص ملا ہوگا۔ اور مجھے لش اور دروازے کے لیے رکشا کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ اچانک تھوڑی دیر کے لیے ہوا رک گئی۔ اتنی دیر میں گرد و غبار سے سڑک صاف ہو چکی تھی۔ رکشا والے نے اپنی رفتار تیز کر دی ہم لش۔ دروازے کے قریب ہی تھے کہ کوئی شخص سڑک پار کرتے ہوئے ہمارے رکشے سے ٹکرایا اور گر پڑا۔

یہ ایک عورت تھی جس کے بالوں میں کہیں کہیں سفید لکیریں تھیں اور جو بوسیدہ لباس پہنے تھی۔ وہ بغیر آواز دیئے چبوترے سے ہمارے سامنے سے سڑک پار کرنے کے لئے چلدی ور حالانکہ رکشے والے نے رکشہ موڑ لیا تھا لیکن اس کی ڈھیلی اور بوسیدہ جیکٹ جس میں کوئی

بٹن بھی نہیں تھا اور جو ہوا میں اڑ رہی تھی، رکشے کے ہینڈل میں پھنس گئی۔ خوش قسمتی سے رکشے والا پہلے ہی سے رفتار سست کر چکا تھا ورنہ اس سے زیادہ بری طرح گرتی اور چوٹ کھاتی۔

وہ زمین پر پڑی تھی اِس لئے رکشے والا اُس کے پاس گیا۔ میرا خیال نہیں تھا کہ وہ بوڑھی عورت زخمی ہوئی ہوگی اور جو کچھ ہوا تھا اس کا چشم دید گواہ بھی وہاں پر کوئی اور نہ تھا۔ اس لئے میں رکشے والے کی اس بیکار ہمدردی پر ناخوش ہوا جو اسے مصیبت میں ڈال سکتی تھی اور مجھے خطرے میں۔ میں نے کہا ـــ "سب کچھ ٹھیک ہے تم آگے چلو۔"

لیکن اُس نے کوئی توجہ نہ دی۔ یا اُس نے شائد کچھ سُنا ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ ہینڈل کے نیچے بیٹھ گیا تھا اور تیزی سے عورت کو اُٹھنے میں مدد دے رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کو سہارا دیتے ہوئے اُس نے پوچھا ـــ

"کیا تم ٹھیک ہو؟"

"مجھے چوٹ لگی ہے۔"

میں دیکھ چکا تھا کہ وہ کتنے آہستہ سے گری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اسے چوٹ نہیں لگ سکتی تھی۔ ضرور وہ بہانہ کر رہی تھی جس سے مجھے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ عورت اُس رکشے والے کو کسی مصیبت میں پھنسانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اس میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب اس رکشے والے کو اس مصیبت سے بچ نکلنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔"

لیکن رکشے والا عورت کے یہ کہنے کے باوجود کہ وہ زخمی تھی، ایک منٹ کے لئے بھی جھجکا نہیں۔ ابھی تک وہ اُس کا بازو تھامے ہوئے تھا اور اس کو آگے بڑھنے میں آہستہ آہستہ مدد دے رہا تھا۔ جب میں نے آگے نظر ڈالی تو وہاں ایک پولس اسٹیشن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تیز ہوا کی وجہ سے کوئی شخص باہر نہیں تھا اِس لئے رکشے والے نے بوڑھی عورت کو دروازے تک پہونچنے میں مدد دی۔

اچانک میں ایک عجیب سنسنی سے ہمکنار ہوا۔ اُسی لمحہ اُس کی گرد آلود پیٹھ لمبی ہوتی

ہوئی دکھائی دی۔ جتنا وہ آگے بڑھ رہا تھا اتنا ہی بڑا ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ میرا دل اُس کی عزت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر ایسا بوجھ ڈال رہا ہے جو میرے فخر کے بنے کوٹ کے نیچے چھوٹی سی شخصیت کو تہہ و بالا کر دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔

مجھے جسم سے اپنی جان نچڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں وہاں ساکت و ساکن بیٹھا رہا۔ میرا ذہن خالی ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ ایک پولیس والا باہر آیا۔ اُس وقت میں رکشے سے نیچے اُترا۔ پولیس والا میرے قریب آیا اور بولا ——

"آپ دوسرا رکشہ لے لیجئے، وہ آپ کو آگے نہیں لیجا سکتا۔"

میں نے بغیر کچھ کہے سُنے اپنی جیب سے ایک مٹھی بھر ریزگاری نکالی اور پولیس والے کو دے دی۔

"مہربانی فرما کر اُس کو یہ دے دیجئے گا۔" میں نے کہا۔

ہوا مکمل طور پر ٹھہر گئی تھی لیکن سڑک اب بھی سنسان تھی۔ میں سوچتا ہوا آگے چل پڑا لیکن میں اپنے خیالات کو دل کی جانب موڑتے ہوئے تقریباً خوفزدہ تھا۔ اُسے چھوڑ کر گیا ہوا تھا۔ میرا اِن مٹھی بھر پیسوں سے کیا مطلب تھا؟ کیا یہ اس کا انعام تھا؟ میں رکشے والے کے بارے میں فیصلہ کرنے والا کون تھا؟ میں ان سوالوں کے جوابات خود ہی نہ دے سکا۔

اب بھی یہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہے۔ اکثر یہ بات مجھے مایوسی میں ڈالے رہتی ہے اور میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ میں اپنے بارے میں سوچوں۔ ان برسوں کے فوجی اور سیاسی حالات میں اسی طرح بھول چکا ہوں جس طرح پرانا کلاسیکی ادب جو میں نے بچپن میں پڑھا تھا لیکن یہ واقعہ رہ رہ کر میرے ذہن میں اُبھرتا رہتا ہے۔ اکثر حقیقت سے زیادہ واضح شکل میں، اور مجھے شرم دلاتا ہے۔ مجھے اصلاح کرنے پر اکساتا ہے اور مجھے نئی ہمت اور امید عطا کرتا ہے۔

شمالی ویت نام — نگیون بان

تلاش اور منزل

ریل چلی جا رہی تھی۔ چاند کے حساب سے نئے سال کی رات تھی۔ کل تیت کا تہوار تھا، ہلکی ہلکی بارش اور فضا میں بہار کی سی کیفیت تھی۔

تین بجے کے قریب گاڑی آہستہ ہوئی۔ انجن نے بڑے زور سے سیٹی دی۔ بہت سے لوگ اس اسٹیشن پر اترے اور سوار ہوئے۔ سوار ہونے والوں میں کچھ تو سپاہی تھے مگر ایک نوجوان جوڑا تھا۔ بیوی ایک بالکل ننھے سے بچے کو گلابی کپڑے میں لپیٹے گود میں دبائے تھی۔ شوہر دو بھاری بھاری ٹوکریاں اٹھائے اس کے پیچھے داخل ہوا۔ بیوی میرے دوست ہوآنگ کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر شوہر نے برساتی سے پانی جھٹکا۔ ٹوکریاں ایک طرف کو لگائیں اور برساتی کو اتار کر کھونٹی پر لٹکانے کے بعد وہ اپنی بیوی کے سامنے، میرے پاس بیٹھ گیا۔

جب ریل روانہ ہوگئی تو میرے دوست ہوآنگ نے بیوی سے پوچھا "آپ کا بچہ کتنا بڑا ہے؟"

عورت نے بچے کا منہ کھول کر ایک بار دیکھا۔ پھر منہ ڈھکتے ہوئے بولی "تین مہینے سے کچھ اوپر کا ہے۔ اگلے مہینے کی بیس کو پورے چار کا ہو جائے گا۔"

"آپ لوگ کہاں اتریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم گیالام جائیں گے۔" شوہر بولا "وہاں سے ہائے پونگ جانے والی گاڑی لے گی جو ہمیں لاک داؤ پہنچائے گی — وہیں ہمارا گھر ہے۔"

"میں نے کہا" مگر آپ لوگوں نے بڑی دیر کر دی۔ کل ہی تو تیت ہے"۔
شوہر ہنسا "جی ہاں، جانا تو تین چار دن پہلے ہی تھا مگر میری بیوی نے خرید
میں اتنی دیر لگائی کہ بس یہ آخری ہی گاڑی مل سکی۔ اب کے ہم لوگ سات سال بعد اپنے
خاندان کے ساتھ تیت کا تہوار منائیں گے"۔

میرا دوست بولا "ارے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ امن ہونے کے بعد
اب تک آپ اپنے گاؤں نہیں گئے"؟

شوہر نے ذرا رک کے جواب دیا "ہاں، ایسا ہی کچھ ہے..... بات یہ ہے کہ
وہ میری بیوی کا خاندان ہے..... میرا تو....." اور وہ چپ ہو گیا۔

میں نے اپنے دوست کا ہاتھ دبایا۔ آخر بے تکے، سوالات کرتے چلے جانے کی
کیا ضرورت تھی۔

بہر کیف اب کی بار شوہر نے سوال کیا — "آپ لوگ کیا ادیب ہیں"! اور اس نے
ہماری کتابوں کی طرف دیکھا جو پاس ہی رکھی تھیں۔

میں نے کہا — "ادیب تو کیا ہیں — مگر ہاں.... کیا آپ کو بھی ادب سے
دلچسپی ہے"؟

اس نے ذرا شرما کر بیوی کی طرف دیکھا "ہاں دلچسپی تو بہت ہے۔ مگر مشکل یہ ہے
کہ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ میری تعلیم بس پرائمری تک ہوئی ہے۔ ویسے یہ
عجیب بات ہے کہ میں کہانیاں تو لکھ نہیں سکتا مگر کہانیاں کہتا اچھی ہوں"۔

بیوی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہم لوگوں سے بولی — "اگر آپ کو کسی
شہزادی کی کہانی سے دلچسپی ہے تو وہ یہ اچھی کہہ لیتے ہیں"!

شوہر نے ذرا برا مانا۔ بولا — "صرف پریوں کی شہزادیوں کی تو نہیں۔ میں اپنے
بسیوں کی شہزادیوں کی بھی کہانی کہہ لیتا ہوں اور آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ ہماری

پریوں نے فرانسیسی دیوؤں کو کس طرح مار بھگایا۔"

پہلے تو عورت مسکرائی، بولی کچھ نہیں — پھر اس نے بچے کو دوسرے پہلو پر لٹایا اور آہستہ سے بولی: "تو اگر یہ ساتھی سننا چاہتے ہیں تو سناؤ۔"

شوہر نے ایک بار پھر بیوی کو نظر بھر کر دیکھا اور کچھ مطمئن ہو کر بولا: "ویسے تو میں اپنی بیوی اور اپنے ساتھیوں کو بہت سے افسانے سنائے ہیں مگر آپ دیویوں کے سامنے سناتے ذرا اوپرا سا لگتا ہے۔ خیر میں کوشش کرتا ہوں — تو ایسا ہوا تھا کہ یہ گذشتہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ جس سال امن ہوا، میں جہاں کام کرتا تھا وہیں تیت کا تہوار بھی منایا کرتا تھا۔ اور وجہ یہ تھی کہ میرے ماں باپ، چھوٹا بھائی اور حاملہ بیوی ۱۹۵۲ء کی بمباری میں مر چکے تھے — میرا اپنا کوئی گھر، کوئی ٹھکانا نہ تھا — تو وہ بھی تیت کی رات تھی۔ دس بجے تک تو میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیلتا رہا، پھر کچھ ایسا پریشان ہوا کہ برساتی اوڑھ کر باہر نکل گیا۔ سڑکوں اور گلیوں میں سناٹا تھا۔ روشنیاں بارش سے بھیگ کر دھندلی پڑ گئی تھیں۔ دور دور سے پٹاخوں اور گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں — مگر چاروں طرف اتنا سناٹا تھا کہ مجھے اپنے جوتوں کی آہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس سڑک پر کے سبھی رہنے والے، تیت منانے کیلئے اپنے اپنے گاؤں چلے گئے تھے۔ میرے دل میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ پاؤں میکانکی انداز سے اٹھ رہے تھے۔ چلتا رہا، چلتا رہا۔ یہاں تک کہ شہر کے دوسرے سرے پر پہونچ گیا کئی جگہ پہرے داروں، سپاہیوں نے گھیرا۔ کاغذات مانگے۔ دیکھ کر واپس کرتے ہوئے بولے "تیت کی رات کو یوں اکیلے کہاں مارے مارے پھر رہے ہو؟" — مگر میں نے انھیں کوئی جواب نہ دیا اور چلتا رہا — جب روشنی کا آخری کھمبا آگیا تو مجھے ایکدم یہ احساس ہوا کہ اس روشنی کے نیچے سے ایک پرچھائیں گذری اور اس کے چلنے کے انداز سے شک ہوا کہ کوئی عورت ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، کچھ اس طرح جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے کم از کم یہ افسانہ اپنی بیوی کو پہلے کبھی نہیں سنایا تھا اور چونکہ بات ایک عورت کی آبرو کی تھی اس لئے اس نے بھانپنا چاہا کہ اس کی بیوی کو کیسا لگ رہا ہے۔ مگر بیوی نے صرف اپنی کمان سی بھویں ذرا سی تان لیں۔ اس کے بیضاوی چہرے پر بس پل بھر کو ایک رنگ آیا اور نکل گیا ــــ بھک کر اس نے اپنے بچے کو ذرا سا اور لپیٹا اور پھر سننے لگی۔

"اس عورت کی عمر کوئی پچیس سال رہی ہوگی یا اس سے کچھ کم، کالی ریشمی قمیص، جس پر لال پھول بنے تھے۔ کالی ساٹن کی پتلون اور کالا ہی اوور کوٹ پہنے تھی۔ یہ سارا لباس یورپ کا سلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سر پر بھی وہ پھیلے ہوئے چھجے کی ایسی ٹوپی پہنے تھی جیسے فرانس میں عورتیں پہنتی ہیں۔ پھر وہ ایکدم میرے سامنے آ گئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ خوبصورت ہے۔ بیضاوی چہرہ، کمان سی بھویں، دلکش آنکھیں، سُرخ ہونٹ۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جیسی ہم لوگ تیت کے موقعہ پر تحفوں سے بھر کر اپنے دوستوں، رشتہ داروں کے لئے لیجاتے ہیں۔ سامنا ہونے پر اس نے تیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے چلا۔ ایک عجیب سی تفتیش میرے ذہن میں پیدا ہو گئی تھی کہ آخر اس ٹھٹھرتی بارش کی رات میں تن تنہا وہ کہاں جا رہی تھی؟ آج سال کی آخری رات تھی، صبح ہمارے سب سے بڑے تہوار کا دن تھا اور وہ اس طرح اکیلی کیوں تھی؟ کیا اس کے بھی میرے طرح کوئی نہ تھا۔ بار بار وہ آہستہ ہوتی، مڑ کر مجھے دیکھتی اور پھر تیز چلنے لگتی۔ جب اس نے دو چار بار ایسا کیا تو میں نے سوچا کہ اس کا بات کرکے رہوں گا اور پھر میں نے اپنے قدم تیز کئے۔ اس کے برابر میں آ گیا اور بولا ــــ

"آپ اتنی رات گئے، بالکل اکیلی۔ کہاں جا رہی ہیں؟"

وہ میری طرف دیکھے بغیر برابر چلتے ہوئے سنجیدگی سے، ذرا سخت لہجے میں بولی

"اپنے کسی ضروری کام سے جا رہی ہوں۔"

پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے، کوئی دیکھتا تو سمجھتا ہم پرانے دوست ہیں — تھوڑی دور چل کر ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ ایکدم رک گئی اور مجھ سے پوچھنے لگی — "ڈی اسی محلہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

میں حیران رہ گیا — اس سوال کے معنی یہ تھے کہ وہ اس جگہ کی رہنے والی نہیں تھی۔ بہرحال میں نے کہا — "ہوگا کوئی پانچ چھ کیلومیٹر — مگر اب اس وقت کیا آپ وہاں جائیں گی؟"

اُس کا لہجہ ذرا نرم ہو گیا۔ "ہاں جانا تو وہیں چاہتی ہوں ..... مگر اندھیرا بہت ہے؟ بجلی کے کھمبے تو یہاں ختم ہو گئے۔"

"اور آپ آئی کہاں سے ہیں؟"

"میں ہنوئے سے آئی تھی اپنی خالہ کے یہاں۔ مگر ان کے محلے میں گئی تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے گھر بدل دیا ہے اور ڈی اسی محلے اُٹھ گئے ہیں۔ میرے بھی کیا پھوٹے نصیب ہیں ....." اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا ...... ہم دونوں پھر چلنے لگے۔

اب کی بار اس نے مجھ سے سوال کیا — "اور آپ کہاں رہتے ہیں اور اتنی رات گئے آپ کیوں سڑک پر ٹہل رہے ہیں؟ بیوی سے کچھ جھگڑا ہوا ہے کیا؟"

"میرے بیوی نہیں ہے۔" میں نے سیدھا سادہ سا جواب دیدیا۔

اُس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ "آپ کی بات کا مجھے اعتبار نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا — "آپ کی مرضی، اعتبار ہو یا نہ ہو۔"

ہم دونوں پھر چلنے لگے۔ وہ دو چار منٹ بعد بولی — "اگر آپ کو فرصت ہو تو مجھے ڈی اسی محلے تک پہنچا دیجئے۔"

"مگر آپ اس وقت کیوں جانا چاہتی ہیں۔ یاد کیجئے شاید یہاں بھی آپ کا کوئی جان پہچان نکل آئے۔ وہاں رات بسر کر لیجئے۔ صبح چلی جائیے گا!"

"ناممکن، صبح تیت تہے۔ نئے سال کا دن، کل تو سفر کرنا منع ہے"

"افوہ ــــ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ کیا آپ یہ سب مانتی ہیں؟"

"نہیں، میں تو نہیں مانتی۔ مگر جن لوگوں کے یہاں جانا ہے ان کو خط لکھ دیا تھا وہ پریشان ہوتے ہوں گے کہ نہ جانے کہاں رہ گئی ــــ جہاں تک میرا سوال ہے میں اکیلی چلی جاؤں گی، آپ نہیں جانا چاہتے تو رہنے دیجئے۔ میں ڈرتی تھوڑا ہی ہوں"

میں نے اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بے حد ڈری ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی، چہرے پر خوف، تھکن، گھبراہٹ اور پسینہ!

میں نے کہا "آپ میرے گھر چلئے، صبح میں آپ کو پہونچا دوں گا یا کسی کو آپ کے ساتھ کر دوں گا"

وہ ذرا اکھڑ کر بولی ــــ "واہ، عورت ایسے کیسے کہیں بھی رات کو رہ جائیگی" پھر ذرا رک کر بولی ــــ "آپ کے گھر پر آپ کے ماں باپ ہوں گے"

"میں نے آپ سے کہا نا، میرا کوئی نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا سارا خاندان بمباری میں ختم ہو چکا ہے"

یہ بات سن کر وہ پل بھر تو جھجکتی رہی پھر میرے ساتھ ہو گئی۔

اتنا کہہ کر شوہر نے پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ میں نے بھی دیکھا۔ بیوی کے چہرے پر بل پڑ گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے دل میں ڈنک سے چبھ رہے ہوں گے۔

"جب ہم آدھے شہر پر پہونچے تو وہ یکایک مجھ سے بالکل قریب آ گئی اور اپنا ایک ہاتھ میرے بازو میں ڈال کر یوں چلنے لگی جیسے میری بیوی ہو۔ اور پھر مجھے اس کی وجہ بھی دکھائی دے گئی ــــ پولیس کا ایک سپاہی جو گشت کر رہا تھا، وہ قریب آ رہا تھا

اور اسی لئے وہ ایسا مجھ سے لپٹ کر چلنے لگی جیسے میری محبوبہ یا بیوی ہو۔ مگر پولس والے نے ہم دونوں کو روکا اور میرے کاغذات دیکھنے کے بعد اس کے کاغذات طلب کئے ـــــ وہ گھبرا گئی اور میری طرف یوں دیکھا جیسے مجھ سے خاموش بھیک مانگ رہی ہو ـــــ ہکلا کے بولی "میں اور یہ ..... یہ میرے ..... یہ میرے ....."

"ان کو اپنے کاغذات دکھائیے!" میں نے کہا۔

وہ اور گھبرا گئی، پیچھے ہٹ گئی اور مجھے تکنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس کوئی کاغذ واغذ نہیں ہے۔ مجھے اس پر طرح طرح کے شبہے ہونے لگے اور میں نے پولیس کے سامنے اسے اپنا واقف کار ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ جس پر اسے پولیس کے ساتھ جانا پڑا۔ کچھ دیر میں روشنی کے آخری کھمبے کے نیچے کھڑا دور تک اسے جاتے دیکھتا رہا ـــــ پھر گھر واپس ہو گیا!

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، مجھے وہ عجیب سا واقعہ بھول گیا۔ عورت کی صورت بھی ذہن سے اتر گئی۔ مگر ڈیڑھ سال بعد ایک شام، میں نے یکایک اپنے ایک ساتھی کو ایک عورت کے ساتھ گلی سے گذرتے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی میری ہی طرح حیران رہ گئی ـــــ پھر میرے ساتھی نے اس سے ملایا کہ یہ لڑکی پارٹی کے کتابچے اور اخبارات بیچنے کے لئے رکھی گئی ہے اور اس کی خاص صفت یہ ہے کہ رات ہو یا دن، شہر ہو یا جنگل، اندھیرا ہو یا اجالا ـــــ یہ لڑکی میلوں کو سوں نہایت تیزی کے ساتھ پیدل چل کر پہونچ سکتی ہے۔ اس ملاقات کے بعد میں نے اس سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر اس کی بس ایک جھلک یہاں وہاں دکھائی دیتی اور پھر غائب ـــــ کبھی دفتر میں میٹنگ ہے، کبھی کسی دور دراز گاؤں میں اخبار بانٹنے جانا ہے تو کبھی پڑھنے کے لئے رات کے اسکول، کبھی دوائیں تقسیم کرنا ہے تو کبھی بچوں کے لئے دودھ ـــــ لیکن ہر بار جب میں اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتا تو میرا

یہ یقین اور بھی پکا ہو جاتا تھا کہ وہ یہی ہے جو تیت کی اُس رات مجھے ملی تھی ۔ بالکل ویسی ـــ البتہ اب اُس کا رنگ سانولا اور جسم دُبلا ہو گیا تھا اور وہ ہاتھ کے بنے نیلے موٹے کپڑے کی قمیص پتلون پہنے رہتی تھی!

اُس زمانے میں آئے دن چاؤ کے لئے میٹنگیں ہوا کرتی تھیں ۔ ایک رات میں طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے میٹنگ کے بجائے اس کے گھر گیا ۔ ایک دن پہلے سکریٹری نے اُسی کو لکھا تھا کہ اُسی دن اُس کے گھر دواؤں کا کچھ اسٹاک آئیگا جسے وہ مختلف جگہوں پر لیجانے کے لئے الگ الگ کرے گی ۔ اس لئے میٹنگ میں نہیں آسکے گی ۔ میں نے جا کر اس سے کہا کہ میری کمر میں درد ہے ۔ مالش کا تیل چاہیئے ۔ تیل کی شیشی اُسے واپس کرتے ہوئے میں نے کہا ......"

اُس کی بیوی زور زور سے ہنسنے لگی ۔ وہ تھوڑا سا کھسیا گیا ۔ مگر پھر مُسکرا کر بولا" دیکھیے بات یہ ہے کہ اب میں آپ ادیبوں کی طرح عمدگی سے تو کہانی نہیں کہہ سکتا مگر میرے سب ساتھیوں کا خیال ہے کہ جب میں کہانی کہتا ہوں تو چھپکلیاں بھی میری بات سننے کے لئے اپنے بلوں سے باہر نکل آتی ہیں ـــ" اور اُس نے پھر کہنا شروع کیا ـــ" میں نے تیل کی شیشی اُسے واپس کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے میں پہلے بھی کہیں آپ سے ملا ہوں!"

اُس نے کچھ گھبرا کر جواب دیا" آپ کو غلطی ہوئی ۔ میں تو ابھی لانگ سون سے آئی ہوں!"

میں نے کہا" ایسا یاد پڑتا ہے کہ لانگ سون کے پاس ہی میں نے آپ کو دیکھا تھا ۔ شہر کے بالکل سرے پر ـــ وہ تیت کی رات تھی اور آپ کالا اوور کوٹ اور ساٹن کی پتلون پہنے تھیں جو یوروپین فیشن کی تھی یعنی فرانسیسی قسم کی ۔" اس کا رنگ اُڑ گیا مگر مسکرا کے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی " آپکو غلط فہمی ہوئی ہے ،

میں نے تو زندگی میں کبھی یوروپین فیشن کا کوٹ اور پتلون نہیں پہنی ۔۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ویتنامی لڑکی فرانسیسی کپڑے پہنے!"

میں حیران ہو کر چپ ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ اُداس رہنے لگی تھی مگر پہلے سے بہت زیادہ کام میں جٹی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھول جانے کی شدت سے کوشش کر رہی ہو۔ جیسے کوئی پرانا نقش تھا، جسے وہ اپنے کام کے گہرے رنگوں سے مٹا دینا چاہتی ہو ۔۔ کیا وہ مجھے بھولنے کی کوشش کر رہی تھی؟ کیا وہ نقش میں تھا جسے وہ اپنے دل سے مٹا دینا چاہتی تھی؟"

" کوئی پندرہ دن کے بعد میں نے ایک دن اس کا موڈ ذرا اچھا دیکھا تو اکیلے میں موقع پا کر پھر وہی بات چھیڑی۔ وہ بگڑ کر بولی: "آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟ میں بہت کچھ بھول جانا چاہتی ہوں مگر آپ نے میری زندگی میں اور بھی کانٹے بو دیے ہیں!"

اُس کی اس بات سے مجھے بہت صدمہ ہوا اور پھر میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی ۔۔ البتہ ایک موقع ایسا آیا کہ ایک بڑی میٹنگ میں اس پر کچھ اعتراضات ہو رہے تھے تو میں اس کی طرف سے خوب لڑا۔ مگر وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی ۔۔ تو پھر میں بھی کچھ نہیں بولا، یہاں تک کہ تیت کا تہوار آ پہونچا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ مگر وہ اسی طرح اپنے کام میں جٹی تھی جیسے اسے پتہ ہی نہ ہو کہ اتنا بڑا تہوار بھی ہے۔

تیت کی رات کو دفتر میں بھی پارٹی تھی جس میں ہم سب شریک تھے، وہ بھی تھی جب سب دفتر سے نکلے تو میں اُس کے پیچھے ہو لیا اور بڑی ہمت کر کے اُس سے اپنے ساتھ چہل قدمی کرنے کی درخواست کی۔"

یہاں پر میرے دوست نے پھر اپنی عادت کے مطابق، ایک بھدا سا سوال کیا۔

آپ اتنی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بیوی کے سامنے یہ سب کچھ بیان کر رہے ہیں۔ آپ کو اس بات سے پریشانی نہیں ہوتی کہ آپ کی بیوی جلے گی؟"

شوہر مسکرایا، اس نے بڑے پیار سے بیوی کی طرف دیکھا اور بولا ——" یہ تو جلنا جانتی ہی نہیں، اور پھر یہ تو ہماری شادی سے پہلے کی بات ہے اس لئے وہ کیوں جلے گی؟" —— اور پھر بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہنے لگا: "اور میں تو اسے صرف اپنے ساتھ ذرا چہل قدمی کے لئے لیجانا چاہتا تھا اور کوئی بات تھوڑا ہی —— تو صاحب گھوم کر جو دیکھتا ہوں تو وہ غائب۔ جیسے میں نے یہ بات اس سے نہیں کسی دیوار سے کہی تھی —— ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تو مجھے اس پر بہت غصہ آیا اور آئندہ کبھی اس سے کوئی واسطہ نہ رکھنے کا پکا عہد کر کے میں اکیلا ہی چل پڑا۔ مگر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ وہ ایک چھوٹی، بالکل چھوٹی سی، اندھی گلی کے نکڑ پر اندر کی طرف مڑنے ہی والی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک بڑا سا بنڈل اور دوسرے میں ایک ٹوکری تھی مجھ سے رہا نہیں گیا۔ ذرا طنز سے بولا:" اچھا تو ادھر کدھر جا رہی ہیں آپ؟ میرا خیال تھا کہ آپ اس دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ مگر ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ تہوار منانے کا ارادہ ہے —— مبارک ہو!"

اس نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھا، میرے طنز کا کچھ نوٹس نہیں لیا، چپ رہی! پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یکایک وہ سڑک پر بنی ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئی، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں اتنا حیران رہ گیا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کیا کروں۔ دو چار منٹ کھڑے رہنے کے بعد میں بھی اس بنچ پر اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا —— تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے اپنے متعلق بتانا شروع کیا۔ وہ ایک کسان کی بیٹی تھی۔ چودہ سال کی عمر میں ایک خفیہ پولیس کے فرانسیسی سارجنٹ نے اس کو اغوا کر لیا تھا، پھر کئی سال تک وہ ایک سے دوسرے

فرانسیسی افسروں کے ہاتھ بکتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ آخری شخص جو ایک لفٹنٹ تھا مارا گیا اور وہ ہنوئے میں اکیلی رہ گئی۔ پھر امن ہوا۔ فرانسیسی فوجوں نے ویتنام چھوڑا اور وہ پھلاتیت آیا، جس رات میری اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس رات وہ فیصلہ کرکے نکلی تھی کہ ایک نئی زندگی شروع کرے گی اور کچھ جانے پہچانے لوگوں کے یہاں جا رہی تھی مگر وہ لوگ اس محلے سے اٹھ چکے تھے ....!"

میں اُس کی یہ داستان سُن کر ششدر رہ گیا اور مجھے وہ اکیلی عورت یاد آئی جو ایک نئی زندگی کی تلاش کرتی ہوئی اس بھیگتی رات میں، اندھیری سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھی، جس نے میرا سہارا لینے، پولیس سے بچنے کیلئے میرا بازو تھاما تھا۔ مجھ سے یہ امید کی تھی کہ میں اُسے اپنا بتا کر بچا لوں گا۔ مگر میں نے اسے سہارا دینے سے صاف انکار کر دیا تھا! — اور میں اپنے آپ کو کامریڈ کہتا تھا۔ میں اپنے کو پارٹی کا ایک وفادار، ایک باشعور رکن سمجھتا تھا!

میں نے شرم سے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر ہمت کرکے بولا "تب تو تمہیں مجھ سے سخت نفرت ہوگی؟" وہ دھیمے سے بولی "ہاں، اس وقت تو مجھے آپ سے سخت نفرت محسوس ہوئی تھی...... مگر پھر...... پھر میں کام کرنے لگی اور اسی میں بہت کچھ بھول گئی...... اور...... اب تو میں آپ کی بہت مشکور ہوں، آپ نے اس دن میٹنگ میں میرا بڑا ساتھ دیا —" پھر رک رک کے بولی "ویسے اب تو آپ کو سب کچھ معلوم ہو گیا، اب آپ سنجیدگی سے بتائیے۔ آپ میرے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "اگر تم مجھے اپنا کامریڈ سمجھو تو میں اس پر فخر کروں گا؟"

اُس نے ذرا شک کی نظر سے مجھے دیکھا۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹوکری اور اخبار اٹھائے۔ میں بھی اٹھا "تو اب تم کہاں جا رہی ہو؟"

"[illegible] گی میں — وہاں...... میں اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہوں!"

"تمہارے کوئی بھائی بھی ہے؟"

اُس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ صرف اُٹھ کر چلنے لگی۔ میں بھی اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ ذرا دور جا کر اُس نے مجھے بتایا کہ اس کے منہ بولے بھائی کا گھر اسی گلی میں تھا ــــ پندرہ برس کا وڈو ــــ اس کے ماں باپ کو زبردستی ویت نام بھیجدیا گیا تھا مگر وہ کہیں چھپ گیا تھا۔ آٹھویں جماعت میں رات کے اسکول میں پڑھتا اور دن کو ایک دوکان میں کام کرتا تھا، وہیں کھاتا تھا، وہ روز اُسے پارٹی کا اخبار دے آتی تھی۔ اگلے دن لے آتی تھی کیونکہ ابھی تک وڈو کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اخبار خرید سکتا۔ وہ اُس سے بہت محبت کرتا تھا اور اُسے اپنی بڑی بہن سمجھتا تھا جس سے اس کی سنسان زندگی میں کچھ اُمنگ، کچھ رس پیدا ہوگیا تھا۔

اتنے میں ریل آہستہ ہونے لگی۔ اور پھر انجن نے ایک زور کی سیٹی دی، گیلاٹ اسٹیشن آگیا تھا جہاں سے ان لوگوں کو ریل بدلنی تھی۔ شوہر ایکدم سے اٹھا۔ برساتی کھونٹی پر سے اتار کر جھاڑی اور پھر بیٹھ کر بولا ـــ "دیکھیے کہانی کیسے اچھے وقت پر ختم ہوئی۔ کھڑکیوں سے جھانکئے، آسمان کے کنارے کنارے ایک نئی صبح کی روشنی جھانک رہی ہے نا؟"

میں نے کہا ـــ "نہیں، اگر وقت ملے تو اس کہانی کا کوئی اور بہتر اختتام کیجئے گا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "ایسی کہانیوں کا اور بہتر اختتام میں آپ ادیبوں کیلئے چھوڑ دیتا ہوں" ریل رک گئی۔ اس نے دونوں ٹوکریاں اٹھائیں، بیوی نے بچے کو اور اچھی طرح (لپیٹا) اور کھڑی ہوگئی۔ میرا دوست بولا "مگر آپنے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیا کبھی بھی وہ عورت پھر تیت منانے اسی جگہ گئی یا اب وہ بھی دفتر ہی میں تہوار گذارتی ہے۔" شوہر نیچے اتر چکا تھا۔ بیوی نے اترتے ہوئے مڑ کر میرے دوست کو جواب دیا "نہیں اسی سال وہ اپنے ننھے بچے کے ساتھ تیت منانے اپنے گم جا رہی ہے" ــــــــــــــ

(ترجمہ:۔ رضیہ سجاد ظہیر)

کرغیزیا چنگیز اتماتوف

سرخ سیب

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی لیکن آئیزباکوف ابھی تک یہ سوچ رہا تھا کہ وہ خط کو کہاں سے شروع کرے؟ وہ اس خط میں کیا لکھے؟ کیا وہ اس خط کو سمجھ سکے گی؟ ان کی ازدواجی زندگی کے کئی پریشان کن سال گذر چکے تھے۔ کیا وہ یہ سب بے عزتیاں، ہیجانی کائیں تہمتیں اور الزامات اور پھر ان کی صلح وصفائی اور آخری بار کی سخت باتیں، اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ اُسے سمجھ سکے گی اور اُسے معاف کر دے گی؟

جب وہ گلی میں رکتی تھی تو لوگ اُسے دیکھنے کے لیے رک جاتے تھے۔ آئیزباکوف کو اس بات کا فخر ہوتا تھا۔ وہ بھی اس کی تمام نزاکتوں اور دوشیزگی کا قائل تھا اور سوچا کرتا تھا کہ یہ سب کس قدر پرکشش اور حسین تھا۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود بھی کوئی چیز ایسی ضرور تھی جو اُسے اس کی محبت سے روکتی تھی۔ وہ بغیر کسی حیرت اور جھجک کے یہ سوچتا تھا کہ وہ کون سی چیز تھی جس کی وجہ سے وہ اُسے پیار کرتا تھا لیکن وہ بغیر کسی بات کے بھی بس اُس سے والہانہ محبت کرتا تھا۔

آئیزباکوف نے کئی بار قلم اٹھایا اور پھر رکھ دیا۔ اور پھر سونے کے کمرے میں اپنی بچی کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ انارہ دن بھر بھاگنے دوڑنے کی وجہ سے اب تھک کر گہری نیند سو رہی تھی۔

"آہ! انارہ! میری بچی! کاش تجھے یہ معلوم ہو سکتا کہ اس رات تیرا باپ کتنی پریشانیوں میں مبتلا ہے۔"

وہ آج انارہ کو شہر سے باہر لے گیا تھا۔ اور وہ بھی صرف یہ بتانے کے لئے کہ اس کی ماں

آج ماسکو میں ہے اور کس کی خواہش ہے کہ اُس کی بیٹی انارہ اس کے پاس پہونچ جائے
یہ فیصلہ خود انارہ کو ہی کرنا تھا کہ وہ کس کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ آئینر باکوف اس تکلیف دہ
بات چیت کو گھر میں بتاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ وہاں کافی عرصے تک ساتھ رہ
تھے۔ اُس نے سوچا کہ ایسی باتیں گھر سے باہر ہی رہ کر بتائی جائیں تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ اُس نے
آنگن میں کھیلتی ہوئی انارہ کو بلایا۔

"سوئیٹر پہن لے بیٹی! ہمیں آج شہر سے باہر جانا ہے"

انارہ نے جذباتی اور جوشیلے انداز میں کہا — "واہ .... واہ .... بہت اچھا"
وہ جلدی سے رک کر بولی — "لیکن پاپا کیوں؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی ذرا سیر و تفریح کے لئے" شاید وہ یہ سمجھ گئی تھی
اُس کے پس پردہ کوئی خاص بات ضرور ہے لیکن اس کا علم اسے کیسے ہو سکتا تھا۔ اسے تو کبھی
بھنک بھی نہیں ملی تھی۔ مگر پھر اسے معلوم تو ہونا ہی تھا۔ اب اس بات کو اور دیر تک نہیں ٹالا جا

خشک پتوں سے ڈھکی سڑکیں ویران تھیں۔ یہ ستمبر کے پت جھڑ کے آخری ایام تھے۔ ب
کی پہلی بارش کے ساتھ سب کچھ ختم ہو جاتا تھا۔ اُس نے یہ بات اُداسی سے سوچی۔ اس نے لائ
سگریٹ جلائی اور پیچھے مڑ کر انارہ کو دیکھا۔ وہ کار کی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ بس
بڑے باغ کے گرد ایک چکر لگا کر وہ اچانک ایک جگہ رک گئے۔

ایسا لگتا تھا کہ ہر چیز نے دوبارہ جنم لیا ہو۔ پھلوں کا باغ اب خالی تھا اور کٹائی
بعد اسے صاف کیا گیا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہتی ہوئی ندی کے پاس کھڑا ہو
سوچ رہا ہو کہ کیا لوگ اب پھر دوبارہ وہاں سے پھل لینے آئیں گے۔ گھاس کی بندھی ہوئی
ڑی کا نٹھیں گذری ہوئی گرمی کی یاد دلا رہی تھیں۔

انارہ کو باغ میں بھاگتے دوڑتے دیکھ کر ہی اُسے یاد آیا کہ وہ وہاں کیوں آیا تھا
اُس نے انارہ کو آواز دی "بیٹی تم کہاں دوڑتی پھر رہی ہو؟ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کر

"پاپا! باتیں پھر کریں گے۔ میں پیڑ پر چڑھنے جا رہی ہوں"۔

وہ دوبارہ پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ بات کیسے شروع کیجائے۔ اچانک اسے یہ محسوس ہوا کہ نارہ کو ایسے ہی بھاگتے دوڑتے رہنا چاہیئے اور اسے اس سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ باغ میں اپنی بچّی کی خوشی اور جوش دیکھ کر اس کی مترنم آواز سن کر اس نے اپنے خیال کو بدل ڈالا اور ایک اونچی جگہ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"پاپا! پاپا! آیئے۔ دیکھئے مجھے کیا ملا ہے؟" وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ پسینے سے شرابور اور سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے ایک سرخ سیب اپنے پاپا کے سامنے رکھ دیا۔ "سیب ملا ہے"۔

"ہاں بہت خوبصورت ہے"۔ اور اس نے ٹھہر کر کہا۔ "پیاری بچّی تو نہیں جانتی کہ یہ سیب خوش نصیبی لائے گا۔ جو شخص بھی اسے کھائے گا خوش رہے گا۔۔۔۔ بہت خوش۔۔۔ یہ مبارک سیب ہے"۔

آئیزنباکوف نے سیب کو رومال سے صاف کیا اور واپس نارہ کو لوٹا دیا۔ جیسے ہی وہ سیب لیکر باغ کی طرف واپس گئی۔ آئیزنباکوف کو ایک دوسرے سیب کی یاد آئی اور بالکل ایک سے ملتے جلتے حادثوں کو سوچتا ہوا کچھ پریشان ہو گیا۔

جنگ کے بعد وہ کھیتی باڑی کے کالج میں کام کرنے کی غرض سے یہاں آیا تھا جہاں اب بھی پڑھتا ہے۔ پت جھڑ میں ایک دن بالکل ویسا ہی جیسا کہ آج کا دن تھا اس کے محکمے کے سب آدمی کھدائی کرنے کے لئے ایک ساجھے کے فارم پر گئے تھے۔ وہ یہاں سارا دن کام کرتے رہے تھے۔ شام کو وہ لوگ تھکے ہارے اور بھوکے شہر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں وہ سب ساجھے کے فارم کے باغ میں رکے۔ ان میں جو لوگ سب سے زیادہ خوش قسمت تھے وہ سیب تلاش کر چکے تھے۔ باقی لوگ سیب تلاش کر کے سڑک پر آ چکے تھے۔ آئیزنباکوف نے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر پتوں سے ڈھکے ہوئے ایک سیب پر پڑی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں یہ اس کا وہم ہی نہ ہو اس لئے وہ آگے کی طرف چلا آیا۔ لیکن پھر واپس لوٹ آیا۔ سیب کے اس درخت کے گرد چکر لگائے، جو اب بھی ان نازک پتوں کی

آڑ میں لٹکا ہوا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں سے اُس کے مرجھائے پتے چمک اُٹھے۔ یوں لگتا تھا کہ اگر اس سیب کے درخت کو دیا سلائی دکھا دی جائے تو اسی میں سے بتیس اُٹھ پڑیں گی۔ اچانک اُس نے اسی سیب کو دیکھا اور دھیرے سے بولا "واہ رے میری قسمت!" ایک بہت بڑا سیب مڑی ہوئی شاخ کے پتوں میں چھپا ہوا تھا۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر سوچا۔ پھر اچھل کر درخت کی شاخ کو نیچے کی طرف جھکا لیا۔ پیروں کی مدد سے اُس نے اچھل کر اس لال گیند کو توڑ لیا۔ اس کی خوشبو اُس کے دماغ میں گھس گئی اور اسے کچھ نشہ محسوس ہونے لگا۔ وہ اپنے دانت اس میں دھنسانے سے خود کو روک نہ سکا تھا۔ ابھی وہ اُس کے دو ٹکڑے کرنے ہی والا تھا کہ وہ جھجکا اور سر کو جھٹک دیا۔ اس نے سوچا کہ یہ سیب وہ اس کو دے گا۔ اس وقت اُسے اس کا خیال کیسے آ گیا تھا؟ لیکن حقیقت میں وہ اس کے بارے میں ہر وقت ہی سوچا کرتا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جس کا نام وہ نہیں جانتا تھا۔

"ساتھیو! مجھے یہ سیب ملا ہے لیکن میں یہ سیب کسی اور کو دوں گا۔"

"لاؤ، ہمیں دکھلاؤ۔ وہ کہاں ہے؟"

"یہ لو! اسے اچھی طرح دیکھو!"

"کسی سے کیا مطلب؟ پیترا کون ہے وہ؟" لمبی ٹانگوں والے پیتر نے کہا جو سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ "یہ معلوم کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ سمجھے!" قریب سے لاری گذری۔ انھوں نے اُسے روکنے کیلئے جھنڈی دکھائی اور سب لوگ اس پر چڑھ گئے۔ آئیر باکوف نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سیب کو اس لڑکی کو دے گا جو پبلک لائبریری میں روزانہ آتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی دور سے سفر کر کے وہاں جایا کرتا تھا۔ وہ دروازے کے پاس میز کے قریب بیٹھ جایا کرتا تھا۔ جب وہ آتی تو وہ ایک لمحے کے لئے اُس کی آنکھوں میں جھانک لیا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت دیر تک دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اُسے بیٹھے بیٹھے اس کا

چہرہ بڑا اچھا لگتا تھا بڑی نفاست سے وہ اپنے بال سنوارتی تھی اور اس کی پلکیں بہت خوبصورت تھیں۔ اس کے بیک ترم ہاتھ جو ہر وقت کچھ نہ کچھ نوٹ بک میں لکھتے رہتے تھے اُس کے برخلاف اُس کے دل میں چوٹ لگتی تھی، جب کوئی اور شخص اس کی میز کے سامنے آکر کھڑا یا اُس کے پڑھنے کے لئے کوئی پرچہ پھینک جاتا تو وہ میز کے نیچے سر جھکاتا اور زیادتی کرنے والے سے لڑنے کے لئے خود کو آمادہ کرتا۔

جب وہ میز سے اُٹھتی یا اپنی کتابیں واپس لوٹاتی تو آئیر باکرف جلدی جلدی اپنی بکھری ہوئی چیزیں جمع کرتا، گلی پار کرنے کے بعد اُس کے انتظار میں کھڑا رہتا اور دور تک چپ چاپ اس کا تعاقب کرتا۔

اپنے ہوٹل میں واپس آکر اُس نے سیب کو اپنے سرہانے کی میز پر رکھدیا اور دوڑ کر آیا۔ اپنے جوتوں پر پالش کی، لائبریری جانے سے قبل اپنے آپ کو اچھی طرح بنایا، سنوارا، جب گھڑی پر نظر ڈالی تو وقت کافی گذر چکا تھا۔ اِس لئے اس نے دوسرے روز جانے کا پروگرام بنایا۔

دوسرے روز سیب کو کاغذ میں لپیٹا اور بغل میں دبا کر لائبریری کی طرف چل پڑا اور وہاں وہ وقت سے پہلے ہی پہونچ گیا اور دروازے کے سامنے میز کے پاس بیٹھ گیا۔ اب وہ سُرخ سیب اس کی گود میں پڑا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ اسی طرح گذر گیا اور وہ ابھی تک نہیں آئی تھی لیکن اس کا دل یہ کہتا تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ آدھ گھنٹہ اور گذر گیا اور پھر بھی نہیں آئی تھی۔ دھیرے دھیرے لوگ کم ہوتے گئے اور اس کو سیب لیکر واپس جانا پڑا۔

دوسرے روز شام کو اُس نے پھر انتظار کیا۔ وہ سیب کو سنبھالے اب بھی کونے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے لائبریری میں اُس کا شدت اور بے چینی سے انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ آخر کار وہ دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے ہی دل کی تیز دھڑکن سے

جیسے اندھا گونگا ہو گیا تھا، جیسے اُس کے ساتھ اکثر ہوتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے مسکرائی۔ لیکن ایسا بھی لگتا تھا کہ جیسے اُس نے مسکراتے ہوئے سر کو بھی جنبش دی ہو۔ پاس سے گذرتے ہوئے اس کے بازو بھی ٹکرا گئے۔ وہ ایک میز کو چھوڑ کر دوسری میز پر اس کے قریب جا کر اور میز پر بیٹھتے ہی وہ پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ پھر وہ پہلے کی طرح اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے اور نقل کرنے میں کافی مصروف نظر آنے لگی تھی۔

آئیزر باکوف انتظار کرتا رہا۔ وقت ویسے ہی گھٹ گھٹ کر گذرنے لگا۔ وہ یہ سوچ کر ڈر بھی رہا تھا اور خوش بھی ہو رہا تھا کہ اب اس کے خوابوں کی تعبیر اُسے مل جائے گی اور پھر اسی کا مستقبل کیا ہوگا؟

باہر روشنیاں جل اٹھی تھیں اور زیادہ تر لوگ وہاں سے بکھرنے لگے تھے — آئیزر باکوف دیکھتا رہا، اُس کا انتظار کرتا رہا اور آخر کار تھک کر اس نے اپنی چیزیں اکٹھا کرنا شروع کیں۔ اپنے لکھے ہوئے کاغذوں کو بریف کیس میں ڈالا اور باہر آگئی۔ وہ سیب کو بغل میں دبائے اپنے آپ ڈھکیلتا ہوا اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ بغیر کچھ بدلے اُس کے برابر چلنے لگی۔

"اوہ..... سنئے ذرا.....؟" اُس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں.....؟" لڑکی نے رُکتے ہوئے اُس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے؟"

باہر نمی چھائی ہوئی تھی۔

"میں..... میں آپ کے لئے سیب لایا ہوں۔"

"سیب..... میں نے کبھی نہیں.....؟"

"لیکن نہیں یہ بات..... نہیں..... یہ..... تو مجھے..... مل گیا۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ مجھے خواہ مخواہ پریشان

کیوں کر رہے ہیں؟" اُس نے بگڑتے ہوئے کہا اور بغیر اس کی طرف دیکھے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

آئیزہ باکوف کھسیایا ہوا نظروں سے اس کا تعاقب کرتا اور سیب کو دیکھتا رہا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ سب کیا ہو گیا؟ اس کا سنہرا خواب، اُس کی طلسمی دنیا یکدم اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گئی۔ وہ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ گھر کی جانب چل پڑا۔ اچانک اس نے سیب کو ایک جھٹکے کے ساتھ کہیں اندھیرے میں پھینک دیا۔ اور وہ ایک آواز کے ساتھ ایک دیوار سے جا لگا۔ اور وہ پھر دوبارہ لائبریری کی طرف نہیں گیا۔

اس کے بعد اس کو بہت سی لڑکیاں ملیں۔ لیکن پھر کسی کو بھی سرخ سیب دینے کے لئے اُس کا دل نہ چاہا اور نہ ہی اُس سے کسی نے مانگا۔ پھر بھی ایک عورت تھی جو اس سے ہمیشہ سرخ سیب کے لئے تقاضے کرتی۔ وہ اس کی بیوی جیرا تھی۔ اس کا خیال اُسے اس وقت آیا جب وہ باڑ کے قریب پت جھڑ سے بھرے پھلوں کے باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یا خدا! وہ اسے اب تک کیوں نہ سمجھ سکا؟

شام ہوتے ہی وہ اور انارہ گھر کی جانب لوٹ پڑے۔ راستے میں تھوڑا آگے جا کر شہر کی روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ کاریتیوں سے ڈھکی ہوئی گلیوں میں سے گذر رہی تھی۔ آئیزہ باکوف نے سگریٹ جلائی اور انارہ کے ہاتھوں میں سیب دیکھتے ہوئے بولا —

"تم نے ابھی تک کھایا کیوں نہیں؟"

"نہیں! یہ میں امّی کو دوں گی۔"

"امّی کو....!" وہ منہ کے اندر بولا۔ اس گلا رندھ گیا۔ "ٹھیک ہے ہم دونوں امّی کے پاس لے چلیں گے۔"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو اور سب کچھ سمجھ رہی ہو۔ اور اگر وہ بھی امی کی طرح ہوتی تو؟ اس کا دل یہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس سرخ سیب کو نہیں ٹھکرائے گی۔ اس نے پھر خط لکھنے کی کوشش نہیں کی...... صبح جب وہ ابھی سویا ہوا تھا، نارہ نے اٹھ کر دیکھا کہ میز پر ایک تار پڑا ہوا تھا جو بھیجا نہیں گیا تھا "بیرا ہم تمہارے پاس آرہے ہیں"۔ نارہ نے قلم اٹھایا اور اس میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا۔

"امی! ہمیں اسٹیشن پر ملئے گا۔ ہم آپ کے لئے سرخ سیب لا رہے ہیں"۔

(ترجمہ: جعفر عباس)

بینیا — سیپرین ایکوینسی

خراب خون

شہر سے دور ایک اُجڑے سے باغ میں پانچ چھ جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ جھونپڑیاں خاصی اچھی قسم کی تھیں مگر اس قدر گھنی چھنی کہ یہ تک نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کوئی گاؤں بسا ہوا ہے۔ ہاں ایک بستی ضرور تھی۔ دن کو ساری بستی پر عجیب سناٹا چھایا رہتا۔ عورتیں اپنی جھونپڑیوں کے دروازوں کے سامنے یا درختوں کے نیچے چارپائیاں بچھائے گپ شپ کرتی رہتیں یا پڑی سویا کرتیں۔ کالے، سانولے، پھیکے، بے رونق ہونے والی عورتیں لیکن شام ہوتے ہی وہاں کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ پوری بستی جاگ سی اٹھتی۔ عورتیں بناؤ سنگار شروع کر دیتیں۔ پھر بن ٹھن کے درست ہو کر چہلیں کرتیں یا باتیں کرتیں۔ ایک گھر سے دوسرے گھر آتی جاتی نظر آتیں۔ اجنبی راہگیروں کو دعوت نظارہ دیتی ہوئی یا اشاروں ہی اشاروں میں اپنے گھر آنے کا بلاوا دیتی ہوئی۔ درختوں سے چھنتی ہوئی چاندنی اور جھونپڑیوں سے نکلتی ہوئی موسیقی کی تانیں سارے باغ میں ایک سحر انگیز فضا پیدا کر دیتیں۔

وہ جس کی تلاش میں تھا وہ بھی شاید یہیں کہیں رہتی ہوگی۔ سُن تو اس نے بھی رکھا تھا۔ اس کے حسن کے چرچے دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ اس اجاڑ سی بستی میں ساری رونق بس اسی کے دم سے ہے۔ کیا قسمت ہوگی اگر وہ واقعی یہاں مل جائے۔ چند جھاڑیوں کو ہٹاتا ہوا منجو اس جھونپڑی کی طرف چلا جو اور جھونپڑیوں سے قدرے ہٹ کر تھی۔ نزدیک پہونچا تو دیکھا کہ دروازے میں ایک بوڑھی عورت

بیٹھی ہوئی ہے۔

"جمو ماما سلام۔" منجو نے سلام کیا۔

جمو نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ ٹھٹھکا سا کھڑا تھا۔ ایک جھینپتی سی مسکراہٹ کے ساتھ عورت نے صورتحال کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"پہلے بھی آ چکے ہو نا یہاں تم۔"

"نہیں، آج میں یہاں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ شہر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

دُبلا پتلا گھونگھریالے بالوں والا نوجوان منجو قدرے کچھ جھجکتا ہوا پلنگ کے پائنتی بیٹھ گیا۔ پھر بوڑھی عورت کو اُس نے ایک سگریٹ پیش کی۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔

"یہ سب جھونپڑیاں کس کی ہیں؟" منجو نے دریافت کیا۔

"میری ہیں اور کس کی ہیں!" بوڑھی عورت نے چیخ کر جواب دیا۔

"ساری جھونپڑیاں آپ کی ہیں؟"

"ہاں پورا باغ، ناریل کے درخت، آم کے درخت اور یہ سامنے مکان سب میرے ہیں۔ یہ عورتیں ان میں رہنے کا کرایہ ادا کرتی ہیں مجھے۔"

"تو آپ تو بہت دولت مند ہوں گی؟" منجو نے سادگی سے کہا۔

بوڑھی عورت نے بڑے غور سے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا مگر منجو کا چہرہ تو نہایت سنجیدہ اور سیدھا سادہ تھا۔

"ہر شخص بس یہی سمجھتا ہے کہ میں بہت امیر ہوں مگر کس کام کی ایسی امارت جبکہ مجھے اس اجاڑ سی جگہ میں ہمیشہ دوسری عورتوں کی طرح رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ کمبخت میری بیٹی میرا کہنا سنتی تو اس وقت ہم ٹھاٹھ سے شریفوں کی طرح ممباسا میں رہتے ہوتے۔"

بوڑھی عورت نے بڑی تلخی سے کہا۔ "تم نے دیکھا ہے مریم کو؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں ماما"۔

"وہ بہت خوبصورت ہے خوب گوری چٹی۔ بالکل منگوں معلوم ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی گورے سے شادی کر سکتی ہے اور پھر اچھی زندگی گذار سکتی ہے۔ مگر وہ کمبخت تو ایک کالے بندر پر مرتی ہے اور ہر شام اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ وہ کبھی آتا ہے کبھی نہیں آتا ــــ آتا بھی ہے تو جوتی کی نوک پر بات کرتا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کیسی لڑکی ہے۔ اس کا تو بس خون خراب ہے، خون ہی خراب ہے"۔ بوڑھی عورت نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا باپ کس قبیلے کا ہے؟"

"قبیلے کا!! اسے بھی گوری نسل کا تھا، منگو بڑا بھاری زمیندار تھا۔ یہاں سے وہاں تک ڈیڑھ دن زمین کا مالک تھا۔ یہ باغ مجھے اسی کا دیا ہوا تو ہے۔ مدتوں میں اس کے ساتھ اس کی بیوی کی طرح رہی ہوں"۔

"تو آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ رہتی ہے؟"

"نہیں۔ میرے ساتھ نہیں۔ وہ اس سامنے والی جھونپڑی میں رہتی ہے"۔

"آپ کا مطلب ہے کہ ......"

"ہاں ہاں یہی مطلب ہے"۔ بوڑھی عورت نے چڑھ کر کہا۔

دور کی جھونپڑی کے سامنے لالٹین کی روشنی میں دو سائے نظر آئے۔ دروازے میں چھوٹے اور گٹھے ہوئے جسم کا ایک مرد کھڑا تھا۔

"یہی تو ہے وہ نامراد کالا بندر"۔ بوڑھی عورت نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"اور وہ مریم ہے؟"

"ہاں"۔

منجو نے بڑے ہی غور سے مریم کو دیکھنا چاہا جیسے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل پڑینگی۔
"اف! یہ تو بلا کی حسین ہے۔ اس سے بھی زیادہ جتنا کہ میں نے سن رکھا ہے۔ بوٹا سا قد، کالے سیاہ بال۔ چاند کی سی موہنی صورت۔ اف اف!
اس آدمی کو دیکھ کر منجو کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔
"کیا یہ اس کا شوہر ہے ماما؟" منجو نے آہستہ سے پوچھا۔
"بیوقوف کہیں کے۔ وہ اس کا کوئی بھی نہیں ہے"۔
اتنے میں چاروں طرف ایک ہلچل سی مچ گئی۔ عورتیں اپنے اپنے گھروں سے نکل آئیں منجو بھی تیزی سے سامنے کی جھونپڑی کی طرف دوڑا۔ اور دروازے میں کھڑے ہوئے اجنبی کی قمیص کا گلا پکڑ کر چیخ اٹھا — "کیوں مارتے ہو اسے۔ کیا حق ہے تمہیں اس عورت کو مارنے کا۔ پرے ہٹو، یہ تمہاری بیوی نہیں ہے"۔
"اپنی راہ چلو صاحبزادے۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو"۔ اجنبی مرد نے اپنا گلا چھڑاتے ہوئے کہا۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ لوگ پیچھے ہٹنے لگے کہ کہیں دونوں میں ہاتھاپائی نہ شروع ہو جائے۔ مریم دونوں مردوں کے درمیان آکھڑی ہوئی اور منجو کو اپنے پیچھے کرتی ہوئی بولی —
"بس رہنے دے بڑا آیا مجھے مارنے والا۔ بندر کہیں کا۔ تو سمجھتا ہے کہ سب ہی تجھ سے ڈرتے ہیں۔ بڑا انسپکٹر بنا پھرتا ہے"۔
"اسے کوئی حق نہیں ہے مارنے کا"۔ مجمع میں سے آواز آئی۔
مریم کے تیور دیکھ کر مجمع پھر دلیر ہونے لگا تھا۔
"مگر وہ اس سے روپیہ بھی تو لیتی ہے"۔ کسی اور نے کہا۔ آپس میں بحثا بحثی شروع ہو گئی۔ کسی نے ایک کی طرفداری کی تو کسی نے دوسرے کی۔ مزاج تیز ہونے لگے۔ گالی گلوج اور سخت کلامی کی نوبت آ گئی۔ لوگ چیخ چیخ کر باتیں کرنے لگے۔ اجنبی نے گھور کر منجو کو دیکھا

منجو نے بھی نفرت بھری نظروں سے اُس پر نگاہ ڈالی۔ مریم نے مٹک کر کہا۔
"یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس کے روپے کی لالچ ہے۔ ایسا سمجھتا ہے تو۔ تو لا نکال روپیہ
نکال!! لوگوں کو معلوم تو ہو!! آج سمجھ ہی لیں ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح"۔
"مجھے کیا سمجھتی ہے۔ میں تجھے پہلے ہی سے خوب جانتا ہوں۔ گڑی کوڑی پر اپنی ادائیں
بیچتی پھرتی ہے۔ جا ہٹ میرے سامنے سے قحبہ کہیں کی"۔
"دیکھو زیادہ بک بک مت کرو تم اب چلے جاؤ یہاں سے"۔ منجو نے مریم کو ایکطرف
کرتے ہوئے کہا۔
اجنبی نے منجو کو ایک نظر دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے مجمع سے باہر نکل گیا۔ سب لوگ
ایکدم خاموش ہو گئے۔ چند لمحوں کے لئے بالکل سناٹا چھایا رہا۔ پھر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے
سب آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے واپس اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چلے گئے۔
بوڑھی عورت نے دیکھا کہ اُس کی بیٹی منجو کے ساتھ اپنی جھونپڑی میں داخل ہو رہی
ہے — بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے وہ سوچنے لگی — "کہ اب اُس کی بیٹی نے دو
سیاہ فاموں کو اپنے پیچھے لگا لیا ہے"۔

جھونپڑی میں منجو نے مریم سے کہا — "وہ تمہارا شوہر تو نہیں ہے مگر طور طریقے
اُس کے بالکل شوہر جیسے ہیں۔ بولو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"
مریم کندھے مٹکاتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہو گئی۔ اس کا لباس
جگہ جگہ سے مسل گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی وہ غضب کی حسین
نظر آ رہی تھی۔ منجو اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔
"ہاں وہ برتاؤ ایسا ہی کرتا ہے جیسے کہ وہ میرا شوہر ہو مگر وہ میرا شوہر نہیں ہے"۔

بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے مریم نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "کوئی چھ مہینے ہوئے مونگی نے میرے یہاں آنا جانا شروع کیا۔ ابتدا میں وہ مجھ سے بڑی محبت اور مہربانی سے پیش آتا رہا اور میں نے بھی اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ پھر وہ ہر روز آنے لگا اور میرے ساتھ سختی کرنے لگا۔ میں ایسے مردوں کو ہرگز پسند نہیں کرتی جو مجھ پر سختی کریں۔ پھر اس نے مجھے روپیہ دینا بھی بند کر دیا اور اپنا حق جتانے لگا جیسے کہ میں اس کی زر خرید لونڈی ہوں۔ آج بھی وہ مجھ سے سختی سے بولا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ میرے یہاں نہ آیا کرے اس پر اس نے مجھے تھپڑ مار دیا۔"

"تو آج اسی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا؟"

"ہاں۔" مریم نے بالوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "وہ انسپکٹر سمجھتا ہے کہ سب اُس کی دھونس میں آ جائیں گے۔ اُس کی نظر میں ساری عورتیں بس مجبائیں ہیں۔"

مریم نے کنگھی کر کے بیچ کی مانگ نکال لی اور پھر دونوں کانوں کے پیچھے ایک ایک پھول لگا کر جوڑا باندھ لیا۔

"تم نے دیکھا نہیں۔" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تم نے دیکھا نہیں کس ٹھاٹھ سے کھڑا حکم چلا رہا تھا۔" مریم اپنے گال پھلا کر انسپکٹر کی نقل کرنے لگی۔ "مگر میں اُس سے ڈرتی تھوڑی ہوں۔ بالکل بھی نہیں!!" مریم اپنے بلاؤز کے بٹن کھول کر چھاتیوں پر عطر لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو سخت نفرت ہے اُس سے!"

منجو دم سادھے ہوئے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا۔ مریم نے مڑ کر اسے دیکھا پھر اٹھ کر منجو کے پاس آ بیٹھی اور ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ اسکے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"تم اس کی طرح تھوڑی ہو۔" مریم نے کہنا شروع کیا۔ "تم تو بڑے ہی نرم دل اور انسان معلوم ہوتے ہو۔"

منجو خاموش رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

مریم نے پھر کہنا شروع کیا۔" میں جانتی ہوں کہ تم مجھے ایک اچھی عورت نہیں سمجھتے ہو۔ مگر کاش تم ایسا نہ سوچتے۔ میں اتنی بُری نہیں ہوں اور ابھی تو تم مجھے اچھی طرح جانتے بھی نہیں ہو۔" مریم نے اپنا سر منجو کے شانے پر رکھ دیا اور پھر آہستہ سے بولی۔ " اگر کوئی مرد محض اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے میرے پاس آئے تو اسے اس کی قیمت تو ضرور ادا کرنی چاہیئے۔ ہے نا؟ میں ٹھیک کہتی ہوں نا؟"

وہ کھسک کر منجو کے اور نزدیک آگئی۔ اُس کی دہکتی ہوئی سانسیں منجو اپنے گالوں پر محسوس کر رہا تھا۔ مریم کا ایک ہاتھ منجو کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔

"مگر تمہاری ماں تو بہت دولت مند ہیں۔ پھر تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" منجو نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میری ماں نے تم سے یہ کہا ہے؟" مریم الگ ہو بیٹھی۔

"ہاں میں اُن سے باتیں کر رہا تھا۔"

"تم میری ماں کو نہیں جانتے۔ وہ بڑی چڑیل عورت ہے۔" مریم نے بڑی تلخی سے کہا۔

"مجھ سے تو انہوں نے جو کچھ کہا وہ میں نے تم سے کہہ دیا۔ کیا وہ تمہاری ماں نہیں ہیں؟"

"ہیں۔ مگر مجھے اُن سے سخت نفرت ہے۔ اتنی نفرت جتنی مجھے اس دنیا میں شاید کسی سے نہ ہو۔" مریم کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"مجھے کیا معلوم تھا۔" منجو نے یہ کہتے ہوئے سوچا کہ ناحق میں نے یہ ذکر چھیڑا۔

مریم کہے جا رہی تھی۔" تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں کسی گورے سے شادی کر لوں۔ میرا باپ گوری نسل کا تھا، مزنگو تھا۔ اس لئے مجھے بھی مزنگو سے شادی کرنا چاہیئے، خواہ وہ کسی شراب خانے میں پڑا ہوا کوئی ملاح ہی کیوں نہ ہو۔"

منجو گردن ہلا کر خاموش رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کی بات پر یقین کرے مریم جو نیم برہنہ چھاتیاں کئے، کانوں میں پھول لگائے سامنے کھڑی ہے یا اُس بڑھیا پر

جو اپنی جھونپڑی کے سامنے چارپائی پر پڑی اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔

"میری ماں مجھ سے ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔" مریم غصّے سے کہہ رہی تھی ۔۔ "پھر میں کیا کروں۔ فاقوں مر جاؤں یا کسی ایسے مرد سے شادی کر لوں جس سے مجھے نفرت ہے ہرگز نہیں۔ مریم اپنی مرضی کی مالک ہے۔ وہ اپنی سی کر کے رہے گی۔"

پھر یکایک اس کا سارا غصّہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ منجو کی طرف دیکھ کر ایکدم کھکھلا کر ہنس پڑی۔ فضا میں جیسے پھول بکھر گئے۔ منجو نے بےتاب ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ مریم نے منجو کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں سے چسپاں کر دیئے۔ کئی لمحے گذر گئے یہ طویل بوسہ منجو کے رگ و ریشے میں سماتا چلا گیا۔ اس کے دماغ میں ہیجان برپا ہو گیا۔۔ سوئے ہوئے خواب جاگ اُٹھے۔

"مریم سنو ۔۔ سنو مریم۔ تم اپنی یہ زندگی اب بالکل چھوڑ دو۔ میرے ساتھ چلو میں تمہاری ساری ضرورتیں پوری کر دوں گا۔ سر آنکھوں میں بٹھاؤں گا۔ تمہیں رُوپے کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ دراصل..... مریم... دراصل میں بھی تمہارے ہی قبیلے کا ہوں۔" منجو کہہ رہا تھا۔

"میرے قبیلے کے! کیا کہا تم نے!" مریم نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں مریم۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی دیکھا نہیں۔ مگر میری ماں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ منگو تھا۔ گوری نسل کا تھا۔ مجھے اپنی ماں کے کہنے کا بھی یقین ہے اور دوسرے میں خود کو دوسروں سے مختلف بھی محسوس کرتا ہوں۔ تمہیں..... تمہیں، مجھ میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا؟"

"ہوں۔ اوں ۔۔ تم اتنے کالے تو نہیں جتنے دوسرے افریقی ہیں۔" مریم نے پاس سے کچھ ہٹ کر منجو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔۔ "ہاں تمہارے چہرے میں سرخی کی جھلک ہے ۔۔ بناوٹ میں بھی قدرے فرق ہے ۔۔ ہاں ۔۔ ہاں ۔۔ دکھائی تو

دیتا ہے۔" مریم کہہ رہی تھی۔

منجو نے مریم کے چہرے پر ایک ہلکی سی طنز یہ مسکراہٹ بھی دیکھی۔ وہ غالباً سوچ رہی تھی کہ خود کو میرے قبیلے کا کہتا ہے حالانکہ بالکل افریقی معلوم ہوتا ہے ممکن ہے باپ کوئی عرب رہا ہو یا ساحل پر کام کرنے والا کوئی سواحلی ہو۔

منجو نے ڈوبتے دل کے ساتھ سلسلہ کلام جاری رکھا۔" میری ماں موکامبا قبیلے کی ہے اور میں بھی آج تک خود کو یہی کہتا رہا ہوں۔ آج پہلی بار ہے کہ میں نے تمہیں حقیقت سے آگاہ کیا۔ مجھے خیال ہوا کہ تم سمجھ سکوگی۔"

"ہاں میں سمجھتی ہوں بوانا۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔" مریم نے منجو کے احساسات کا کچھ کچھ اندازہ لگاتے ہوئے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

ادھر منجو کو ذلت کے احساس سے ابکائی سی آنے لگی۔ وہ غم و غصے کی گرمی سے پھنک اٹھا۔ پھر اُس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ اس وقت مریم کو یہ فرق نظر نہ آئے۔ تو بھی وہ ثابت کرے گا کہ منجو اور مردوں سے مختلف ہے۔ خالی خولی لفظوں سے نہیں بلکہ عمل سے۔ وہ عمل سے ثابت کردے گا۔ اُس نے جیب میں اپنے بٹوے کو محسوس کیا۔ پھر اسے نکال لیا اس میں اس کی ساڑھے مہینے کی تنخواہ تھی۔ اسے دیکر وہ ساڑھے مہینے فاقے کرے گا۔ مگر اب بٹوہ جیب میں واپس رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ اور مردوں کی طرح نہیں ہے۔ مریم کو یہ ماننا ہی پڑے گا۔ اُس نے بٹوے کا سارا روپیہ پلنگ پر انڈیل دیا۔ ایک سو اسی شلنگ کے نوٹ پلنگ پر سامنے پڑے تھے۔ منجو نے پلندے کو مریم کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔" لو۔۔۔ لو رکھو اسے مگر ایک بات یاد رکھنا۔"

"جی۔۔۔ جی۔ بوانا۔" مریم نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔ دل میں وہ سوچ رہی تھی کہ عجیب قسم کا آدمی ہے سارا روپیہ اٹھاکر مجھے دیدیا۔

وعدہ کرو مریم کہ اب تم اُس انسپکٹر سے کبھی نہیں ملوگی بلکہ کسی اور مرد سے بھی

نہیں ملوگی۔ میں جتنا کماؤں گا سب تم کو دیدیا کروں گا۔ ہم چل کر ممباسہ میں رہیں گے بھول جاؤ اس منحوس جگہ کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ میری کمائی ہم دونوں کے لئے کافی ہوگی"۔

"ہم دونوں کے لئے"۔ مریم نے حیران ہوکر منجو کو دیکھا۔ پھر سارا روپیہ سمیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے بولی ۔" میں سمجھی نہیں بوانا! کیا تم مجھے اپنے ساتھ رکھو گے؟"

"ہاں"۔

"اپنی بیوی کی طرح؟ مگر کیوں!" مریم نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی تو بتا چکا ہوں کہ کیوں۔ اس وقت تمھیں یقین نہیں آرہا ہے مگر ایکدن تم مانوگی کہ میں سچ کہہ رہا تھا۔ ہم یہاں بیوی کی طرح رہیں گے ممباسہ میں۔ ہمارے بچے ہوں گے۔ ہمارا اپنا گھر ہوگا۔ تم یہاں کی زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جاؤگی۔ ایک بھیانک خواب کی طرح!!"

"موانگی اور تم ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہو۔ اس نے مجھ سے کبھی اسطرح باتیں نہیں کیں"۔ مریم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

منجو کا چہرہ نرم پڑ گیا۔

"سب مرد ایک سے نہیں ہوتے ہیں مریم! میں تمھیں اپنا بنا کے رکھوں گا۔ ہم ——— ہم اپنے گھر میں رہا کریں گے"۔

"تم میرے سارے کپڑے خرید دوگے جتنے بھی میں چاہوں"۔

"ہاں۔ ہاں مریم۔ میری ہر چیز تمھاری ہوگی"۔

"سنو! باہر یہ شور کیسا ہو رہا ہے؟"

"کدھر، کہاں؟"

مریم نے سہم کر کہا اور دوڑ کر دروازے کی درازیں سے جھانکا، وہ لوگ ہیں

وہی لوگ ہیں۔ تم چھپ جاؤ۔ جلدی سے چھپ جاؤ۔"

باہر سے لوگوں کے بھاری بھاری بوٹوں کی آواز مریم کے دروازے تک آئی اور رک گئی ۔۔۔ "کھولو دروازہ کھولو" کسی نے چیخ کر کہا۔

"چھپ جاؤ بوانا۔ پلنگ کے نیچے چھپ جاؤ" مریم نے آہستہ سے کہا۔

"کھولو دروازہ کھولو مریم" باہر سے ایک گرجدار آواز میں حکم ملا۔

"مریم دروازہ کھول دو" منجو نے نہایت اطمینان سے کہا۔

مریم منجو کو گھورنے لگی۔ پھر اُس نے دروازہ کھول دیا۔

موانگی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پولیس انسپکٹر کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ ساتھ میں ایک سپاہی تھا جس کے بوٹوں کے تلے میں موٹی موٹی کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ سپاہی دروازے پر ہی رک گیا۔

"ڈیوٹی پر آئے ہیں اس وقت ہم لوگ" انسپکٹر نے کمرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا" جن لوگوں نے ٹیکس ادا نہیں کیا وہ فوراً اپنا ٹیکس ادا کردیں ورنہ گرفتار کر لئے جائیں گے"

"تم لوگ ٹیکس جمع کرنے رات کو نکلتے ہو" منجو نے طنز سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ مجرموں کو پکڑنے کے لئے کوئی وقت تو مقرر ہے نہیں"

"آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں انسپکٹر صاحب۔ لاؤ ٹیکس کی رسید نکالو تو ہم لوگ جائیں" سپاہی نے دروازے پر سے ہیکڑی جمائی۔

منجو نے جیب سے کچھ کاغذات نکال کر سامنے ڈال دیئے۔ انسپکٹر بڑے آرام سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور مونچھوں پر ہاتھ دیتے ہوئے ایک ایک کاغذ کو الگ الگ کر کے دیکھنے لگا۔ منجو انسپکٹر کو دیکھ رہا تھا، گٹھا ہوا جسم، متناسب اعضا۔ پولیس کی وردی میں انسپکٹر واقعی خاصا بارعب اور حسین معلوم ہو رہا تھا۔ کاغذات واپس دیتے ہوئے

انسپکٹر نے کہا۔
"اور بھی کچھ ہے؟"
"اور کیا ہوگا؟" منجو بولا۔
"اور کوئی کاغذ نہیں ہے؟"
"نہیں۔"
"تو پھر چلو ہمارے ساتھ کوتوالی چلو۔"
"چلو آج کی رات سرکار کے مہمان رہو بوانا۔" سپاہی نے آگے بڑھ کر ہتھکڑیاں نکالتے ہوئے کہا۔
"میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ مجھے تم ہرگز گرفتار نہیں کر سکتے۔" منجو نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔
"تو پھر دکھاؤ اس سال کے ٹیکس کی رسید۔ دکھاؤ کہاں ہے وہ؟" انسپکٹر نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔
"اس سال کے ٹیکس کی ادائیگی کے لئے تو ابھی پورا مہینہ باقی ہے۔ میں ممباسہ کا رہنے والا ہوں۔ وہاں تو اگلے مہینے یہ ٹیکس دیا جائے گا۔"
مگر یہ تو ممباسہ نہیں ہے۔ تم ممباسہ کی میونسپل حدود سے پانچ میل باہر ضلع کیکوئی میں کھڑے ہوئے ہو۔ یہاں ٹیکس کب کا ادا کیا جا چکا۔" انسپکٹر نے اپنے بٹوے میں سے اپنی ٹیکس کی رسید دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رہی میری رسید۔"
"ہوگی مگر مجھے تو اگلے مہینے یہ ٹیکس دینا ہے۔" منجو نے لاپرواہی سے کہا۔
"بہت خوب۔ مگر ضلع کیکوئی سے تو آج آپ ٹیکس ادا کئے بغیر جا نہیں سکتے۔" انسپکٹر نے ٹھنڈے ٹھنڈے کہا۔
"اگر تم اس وقت بھی ادا کر دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔" سپاہی نے لقمہ دیا۔

"ہاں! ہاں! یہ ممکن ہو سکتا ہے"۔ انسپکٹر نے احسان جمانے کے لہجے میں کہا۔
"اچھا یہ ہو سکتا ہے تو لو ٹیکس۔ کتنا روپیہ دینا ہے۔ مریم نے آگے بڑھ کر پوچھا"
"کُل پینتالیس شلنگ بس"۔ سپاہی نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔
مریم اسکرٹ کی جیب میں سے نوٹ نکال کر روپیہ گننے لگی۔
"مگر تم کیوں ادا کر رہی ہو۔ تم کو اس سے کیا مطلب ہے"۔ انسپکٹر کرخت لہجے میں بولا۔
"ہے مطلب۔ یہ اچھا آدمی ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے کبھی وقت پڑا تو یہ میرے کام آئے گا"۔
"تم ہرگز ٹیکس مت ادا کرو مریم۔ میں جیل جانے کو تیار ہوں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ تم میرا انتظار کرنا۔ ہاں مریم!"۔ منگو نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔
"لو یہ لو اپنے پینتالیس شلنگ اور دفعان ہو یہاں سے"۔ مریم نے انسپکٹر کی طرف روپیہ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"واللہ کیا دل گردے کی عورت ہے انسپکٹر صاحب۔ اپنی جیب سے روپیہ دیکر اُسے جیل جانے سے بچا لیا"۔ سپاہی بولا۔
انسپکٹر نے گویا سنا ہی نہیں اور اپنی ٹوپی اتار کر آرام سے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ کچھ دیر خاموشی سے کش لگاتا رہا۔ کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب کی نگاہیں انسپکٹر کی طرف تھیں۔ انسپکٹر نے آہستہ سے مڑ کر مریم کو دیکھا۔ مریم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔
"لو یہ سگریٹ پیو۔ اس وقت میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ چلو —— چلو اِدھر آؤ"!
منگو جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ سپاہی بھی جو بڑی دلچسپی سے سارا منظر دیکھ

ہا تھا بنجو کے پیچھے پیچھے باہر آگیا۔

"گدڑی چٹی بالکل منگول معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے کہاں کا خون ہے حرامزادی میں ـــــ" سپاہی بولا۔

"خراب خون ہے۔ خود اس کی ماں نے بتایا ہے مجھے ـــــ خراب خون ہے!"

(ترجمہ: بیگم سعیدہ رضا)

یحییٰ حقی

پیتل کی مسہری

زینب کو اپنے نئے گھر کے لئے خریداری کرنے میں مزا تو بہت آیا مگر کچھ باتیں اُسے کھل بھی گئیں۔ ہوا یوں کہ اُسے دیکھ دیکھ کر سخت کوفت ہوتی تھی کہ اس کی ماں اپنے آپ کو مٹا مٹا کر بیٹی کے لئے جہیز تیار کر رہی تھی۔ ماں کو ایک ایک چیز کا دھیان تھا۔ لوٹے، کٹورے سے لیکر کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیاں اور غسلخانے کی تپائی سے لیکر ہال کمرے کے دیوان تک، حتیٰ کہ اس نے دو جھاڑو بھی لے لی تھیں۔ ایک ملائم اور ایک سخت تنکوں والی، ایک بڑے موٹھ اور ایک ایک چھوٹے موٹھ والی۔ مگر اس وقت زینب کھسیا کر رونے لگتی تھی جب اس کی ماں اصلی ریشم کے بجائے نقلی ریشم کے فوائد جتاتے ہوئے آخر میں کہتی "بیٹی! یہ تو شروعات ہے، ابھی تو ہمیں اور بھی بہت سی ضروری چیزیں خریدنی ہیں۔"

ان لوگوں کا خاندان بڑا عالی نسب مگر معمولی حیثیت کا تھا۔ زینب کے والد کے انتقال کے بعد مالی حالت اور بگڑ گئی اور پھر زینب کی ماں سیدہ عدیلہ نے دوسرا نکاح کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ سوتیلا باپ میری اکلوتی بچی سے نہ جانے کیسا سلوک کرے۔ پاس پڑوس کے لوگ سیدہ عدیلہ کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جدھر سے وہ اپنا وجود برقع میں لپیٹے، نقاب ڈالے گذر جاتی، لوگ نظریں جھکا لیتے، یہاں تک کہ مرد بھی کھڑے ہو جاتے۔

تھوڑا تھوڑا کر کے گھر کی جمع پونجی خرچ ہوتی رہی۔ کچھ بھاری سامان بکا، یہاں تک کہ زینب کی منگنی ہو گئی۔ اس کے منگیتر نے ساس سے بہت اصرار کیا کہ شادی کے بعد وہ ان ہی لوگوں کے گھر رہنے کا فیصلہ کرے مگر عدیلہ نے اسے منظور نہیں کیا ـــ دنیا کیا کہے گی کہ کیا اس لئے بیٹی کا گھر بسایا تھا کہ داماد کے ٹکڑوں پر جا پڑی اور اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ہمیشہ اپنے ہی گھر میں رہے گی۔ جہاں وہ پیدا ہوئی، اپنے چچا کے بیٹے کو بیاہی گئی اور شادی کے بعد بھی رہتی رہی۔ وہاں سے تو وہ بس سیدھی قبرستان ہی جائے گی، اور کہیں نہیں۔

"ایسی بات نہ کہو اماں۔ خدا تمہیں سلامت رکھے، میری عمر تم کو لگے"۔ زینب نے کہا۔

ماں بولی "ارے نہیں بیٹی، اس میں کیا دھرا ہے، ایک نہ ایک دن تو سبھی کو جانا ہے"۔

زینب نے اپنی ماں کی چھتر چھایا میں پرورش پائی تھی۔ اس کی شادی کے دن تک ماں بیٹی ایک ہی پلنگ پر سوتی تھیں۔ رات کو وہ اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیتی اور اس کے نرم گرم سینے سے لپٹ جاتی ـــ آہ پروردگار، ماں کی سانس میں کتنی خوشبو تھی، کیسی عجیب سی مٹھاس۔ اسے اپنی ماں پر بڑا ناز تھا جس نے کبھی کوئی ذلیل حرکت کرنا تو درکنار کوئی نازیبا کلمہ تک زبان سے نکالنا اپنی شان کے خلاف سمجھا تھا۔ وہ اپنی ماں سے محبت نہیں، پرستش کرتی تھی۔ ایک ایسا جذبہ تھا جو بہ یک وقت اس میں خوشی اور خوف دونوں کا ایک عجیب سا احساس پیدا کرتا تھا ـــ مگر آج وہی زینب تھی جو اپنی ماں کو گھسیٹتی، ایک دوکان سے دوسری دوکان چلتی جاتی تھی۔ جب اس کے اپنے پاؤں لال انگارہ ہو جاتے، سوج جاتے تو بھی وہ اپنے پیچھے پیچھے چلتی ہانپتی ہوئی بوڑھی عورت سے یہ پوچھنا بھول جاتی کہ

کیا وہ بھی تھک گئی ہے، سستانا چاہتی ہے۔ جیسے غم انسان کو کچھ سوچنے کی اجازت نہیں دیتا، اسی طرح خوشی بھی اس کے ذہن سے اپنے سوا بہت کچھ محو کر دیتی ہے۔

زینب نے فرنیچر کی دوکان میں ایک لکڑی کی مسہری دیکھی تھی اور اسے خریدنا چاہتی تھی۔ دراصل مسہری کے سامنے والے حصے پر جو ڈیزائن بنا تھا وہ اسے بہت پسند آیا تھا۔ اور پسند آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہی ڈیزائن کپڑوں کی الماری پر بھی بنا تھا ــــ گویا اس طرح ایک سیٹ بن جائے گا جو بہت اچھا لگے گا یہ نہیں کہ الماری اور طرح کی اور مسہری اور قسم کی۔ پھر اس مسہری میں دونوں طرف دو چھوٹی چھوٹی درازوں والی میزیں بھی لگی تھیں جو کھل بھی سکتی تھیں، بند بھی ہو سکتی تھیں ــــ زینب نے اپنے تصور میں مسہری پہ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھایا اور میز پر سے ضرورت کی کوئی چیز بھی اٹھالی ــــ یا لیٹے لیٹے دراز کھولی، کوئی چیز نکالی، بند کر دی ــــ اور وہ یہ تصور کر کے بے حد خوش ہوئی تھی ــــ بڑا مزہ آئے گا ــــ یہ تھوڑا ہی کہ کوئی بھی چیز درکار ہو تو کمرے کے کونوں کھدروں میں ڈھونڈتے پھرو، جیسے اس کی اماں تھیں کہ ہر چیز پلنگ کے نیچے، بستر کے سرہانے ــــ مجال ہے کبھی وقت پر کچھ مل جائے۔

مگر سیدہ عدیلہ نے سختی کے ساتھ اپنی بیٹی کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ "بیٹی! یہ آج کل کے دکھاوے والے فیشن پر نہ جاؤ۔ اس چمکدار پالش کو اگر ذرا سا کھرچ دو تو اندر سے کیا نکلے گا، سڑی ہوئی لکڑی۔ جو کچھ ہی سال میں تڑخ جائے گی۔ بھلا استعمال اور اٹھا دھری کو یہ لکڑی برداشت کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں دیمک بھی لگ سکتی ہے اور کھٹمل تو خیر ہو ہی جائیں گے۔ پھر تم کیوں خواہ مخواہ کو یہ دردسری مول لو۔"

چنانچہ بیٹی کی آنکھوں سے نکل کر، گالوں پر بہہ کر، منہ میں جاتے ہوئے آنسوؤں کے

باوجود عدیلہ نے اس کے لئے ایک نہایت شاندار پیتل کی مسہری خریدی۔ آجکل کی سی پیتل کے پتّر، جڑی ہوئی نہیں، پرانے قسم کی مضبوط اصلی پیتل کی مسہری۔ جس کے چاروں ستون اتنے اُونچے تھے کہ تقریباً چھت سے بات کرتے تھے، ہر ستون کے سرے پر ایک چھوٹا سا گنبد بنا تھا اور سرہانے کی طرف جیسے کسی بزرگ کے مزار کی سی جالی تھی جس میں چھوٹے بڑے چھلے اور دائرے نہایت پیچیدگیوں کیساتھ ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے بڑا حسین و مقدس نمونہ بنا رہے تھے اور یہ چھلے ایسی کیلوں سے جڑے تھے جن کے سر گول گول تھے اور بھلا بھل دمک رہے تھے۔ ایسی مسہری سے واقعی دل کی اتھل پتھل اور جوش کو نرمی اور گرمی کا احساس ہوسکتا تھا، یہ اپنے مالک کی عالی نسبی اور اس کے کلاسیکل مذاق سلیم کو ظاہر کرتی تھی۔ ایسے پلنگ پر لیٹ کر جسم کو روحانی سکون راحت مل سکتی تھی۔ جب سیّدہ عدیلہ نے چھوٹے سے قرآن مجید کا سبز جزدان، سی ٹانک کر تیار کیا تو اُس کو مسہری کے سرہانے کے داہنے ستون والے گنبد پر لٹکاتے ہوئے بیٹی سے بولی "لو، اب بتاؤ کہ وہ ردّی، لکڑی کی کھپرا مسہری ہوتی تو یہ قرآن مجید کہاں ٹانگا جاتا — بھلا وہ اس کے شایان شان تھی؟"

پیتل کی اس عظیم الشان مسہری نے زینب کی شب عروسی دیکھی، پھر اسی پر اُس کا پہلا بیٹا، پھر بیٹی، اور پھر دونوں جڑواں بچے پیدا ہوئے اور جتنے حمل ساقط ہوئے اُن کا تو کوئی حساب ہی نہیں — سال کے بعد سال گذرتے رہے، یہاں تک کہ وقت نے اس مسہری پر بھی اپنے نشان چھوڑنے شروع کر دیئے۔ گنبد ڈھیلے ہو ہو کر نکل گئے اور چاروں ستون ایسے لگنے لگے جیسے کھلے منہ والی پانی کی نالیاں جن کے کنارے کھردرے ہوتے ہیں، چمک دمک مدّھم پڑ گئی، دائروں والی جالی میں سے کچھ چھلے بھی نکل گئے جس کی وجہ سے نمونہ نامکمل لگنے لگا۔ کیلیں بھی ننگے ننگے سروں کی طرح لگنے لگیں، کچھ یوں نکل آئیں کہ ہاتھ لگاؤ تو چبھیں۔ ستونوں کے پائے بھی باہر کی طرف کچھ اس طرح پھیلے جیسے

پیشاب کرتے ہوئے گھوڑے کی ٹانگیں ـــ اور اب مسہری اتنا چرچرانے بھی لگی تھی کہ چڑھتے اترتے آواز ہوتی تھی! مگر اپنے زخموں اور دکھ دردوں کے باوجود وہ مسلسل کھڑی رہتی۔ اس کی گود کا پھیلاؤ برابر سونے والوں کو اپنی آغوش میں بخوشی سمیٹتا اور اور ان کو آرام و آسائش پہونچاتا رہا۔ زینب اور اس کا شوہر اور دونوں کے بیچ میں ایک بچہ ـــ تینوں اس پر سوتے، اگر کوئی بچہ بیمار ہوتا تو وہ بھی وہیں آگھتا ـــ اب تو اگر کوئی اس کے گدّے کو الٹ کر یا اس کے نیچے جھانک کر دیکھتا تو نہ جانے کتنے کاغذ اور روپے پیسے یا رسالے، دفتی کے بکس، اخبار اور کپڑے اُس کے نیچے دکھائی دیتے اور نہ جانے کیا الم غلم نظر آتا۔ کہتے ہیں نا جیسا سوت ویسی پیٹی، جیسی ماں ویسی بیٹی!

یہ مسہری زینب کی جائے پناہ تھی۔ گھر کا کام علی الصباح سے شروع ہو کر رات کو دیر تک چلتا رہتا تھا اور اس سے تھک کر وہ جب بھی وقتاً فوقتاً دن میں تھوڑی دیر کے لئے بھی یا رات کو سونے کے لئے اپنا بھاری بھر کم، تھکا ماندہ جسم اس مسہری کے حوالے کرتی تو اُسے ایک عجیب سا ہلکا پن محسوس ہوتا جیسے کسی نے اُسے اپنی گرم و نرم ہتھیلیوں میں دبایا ہے۔ بالوں میں پن لگا کر وہ ایک کڑھے ہوئے رومال سے بال لپیٹتی اور سونے کے لئے لیٹ جاتی اور سوتے وقت اسے محسوس ہوتا کہ وہ اب بھی وہی جوان اور حسین لڑکی ہے جو اپنی ماں سے لپٹ کر سویا کرتی تھی کبھی کبھی اس کا شوہر رات کو دیر سے کام پر سے واپس ہوتا تو وہ اُس کے انتظار میں مسہری پر لیٹی رہتی، اس وقت مسہری پر کافی جگہ ہوتی وہ کبھی ادھر کروٹ بدلتی کبھی اُدھر اور اِس طرح ہی اُس کی آنکھ بھی لگ جاتی، یوں اینٹھ اینٹھ کر سونے میں بڑا مزہ آتا۔ اب اگر کوئی زینب سے وہ مسہری لے لیتا تو وہ زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ یہاں تک کہ اب تو وہ جب میکے جاتی اور پہلے کی طرح ماں کے بازوؤں میں سوتی تو بھی اسے اپنی مسہری

یاد آتی رہتی۔

سیدہ عدیلہ تقریبوں میں بیٹی کے گھر آیا کرتی تھی۔ وہ ملاقاتیں بڑی پر تکلف ہوتی تھیں۔ بچے نانی کے آنے سے مارے خوشی کے چیخیں مارنے لگتے، اور عدیلہ ہمیشہ ہی ان کے لئے ٹوکریاں بھر بھر کے نان، میٹھے بسکٹ، سموسے، بڑے بڑے تازے انڈے اور ایک صاف کی ہوئی بطخ لاتی جس کی زرد زرد چربی عنبر کی طرح چمکتی۔ رات کو ماں ہال میں صوفے پر سوتی کیونکہ وہ سب کو یقین دلاتی کہ اسے دیوان پر سونا اچھا لگتا تھا۔ دیوان بڑے کام کی چیز ہے۔ سونے کے لئے سستانے کے لئے، دن میں قیلولے کے لئے اور دکھتی ہوئی ٹانگوں کو آرام دینے کے لئے ـــــ اگر کوئی ملنے والی آگئی تو تکیے کو دیوان کے سرہانے سے بیچ میں کھسکایا، اسی سے کمر ٹکائی اور بیٹھ گئے۔ آنیوالی کو بھی پاس ہی بٹھایا۔ پھر دیوان کے ایک طرف میز بھی لگی تھی۔ ٹانگوں میں درد ہو تو کھانے یا ناشتے کی کشتی وہیں رکھ لی اور کھالیا لیکن ان سب باتوں کے باوجود حقیقت یہ تھی کہ زینب کے گھر میں پلنگ ایک ہی تھا جو اپنی تمام روایتی شان و شوکت کے ساتھ موجود تو ضرور تھا مگر عدیلہ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ تو مسہری پر سوئے اور اس کے پیارے زمین پر سوئیں۔ دیوان پر تو ایک سے زیادہ آدمی، ظاہر ہے کہ نہیں سو سکتا تھا

جب عدیلہ آخری بار اپنی بیٹی کے یہاں آئی تب بھی اس نے دیوان پر ہی بیٹھ کر کھانا کھایا تھا ـــ کچھ سالن اور گوشت جو بچے رکھے تھے اور کسی قدر سوکھ گئے تھے اس کے بعد اس نے تھوڑا سا گڑ کھایا اور گڑ کے کھاتے ہی اسے اپنا پیٹ بھاری محسوس ہونے لگا جیسے کھانا کلیجے پر رکھا ہو۔ شاید گڑ کچھ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے ایک گلاس پانی مانگا اور بیٹی سے کہا کہ اس میں ایک بوند سنترے کا ست بھی ملادے۔ پانی پی کر وہ سو گئی مگر صبح اس سے تکیے پر سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ زینب نے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو جل رہا تھا۔ اس کی ماں کو تیز بخار تھا۔

بیٹی کی پریشانی دیکھ کر عدیلہ نے اُسے تسلی دی کہ ـــ "بیٹی! کوئی بات نہیں ہے اچھی ہو جاؤں گی، اتنا کیوں گھبرا رہی ہے"

پھر اسپرین دی گئی، لیموں کی چائے، سیم کا شوربہ۔ مگر کسی چیز سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بخار بڑھتا ہی گیا اور شام تک مریضہ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ زینب کا رنگ اُڑ گیا تھا اور اُس کے پیر تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی کہ ایکا ایکی یہ کیا ہوا۔ اگر اسکی ماں چیختی چلاتی تو برداشت کرنا زینب کے لئے شاید آسان ہوتا۔ مگر اپنی ماں کو یوں سکتے کے عالم میں دیکھ کر اُس کے آئے حواس گم ہو جانے تھے۔

اور جب اس نے دیکھا کہ اُس کی ماں اپنے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کر رہی ہے تب تو زینب کے زار و قطار آنسو بہنے لگے ـــ سیدہ عدیلہ جس کی زندگی اتنی پاک صاف اور با حیا تھی کہ کسی نے کبھی اس کے بارے میں نہ کوئی بات سُنی نہ کہی۔ اُس کے ہوش اتنے بے کار ہو چکے تھے کہ وہ اپنے جسم کو ننگا کر دینے کی کوشش کر رہی ہو ـــ آہ! اب اُسے فوراً اپنی ماں کو مسہری پر لٹانا چاہیئے۔ کبھی وہ اسی پلنگ سے دیوان پر سے نیچے لڑھک پڑے تو ...... اب تک اُس نے اپنی ماں کی کوئی خدمت کیوں نہیں کی؟ مگر اسے کیا خبر تھی کہ یکایک ایسی بیماری اس کو آ دبوچے گی کہ سوچنے کی بھی مہلت نہیں دیگی۔ وہ خود اپنے شوہر اور بچوں سمیت زمین پر توشک بچھا کر سو رہے گی اور اب آئندہ بھی سویا کرے گی مگر اب وہ اپنی ماں کو کبھی اپنے یہاں سے نہیں جانے دے گی۔

پھر زینب نے شوہر کو آواز دی اور دونوں نے ملکر سیدہ عدیلہ کو اُٹھایا۔ وہ ذبح کی ہوئی بھیڑ کی طرح تڑپ رہی تھی، پھر بھی دونوں نے مل کر اسے چادر سمیت اُٹھایا اور پیتل کی مسہری پر رکھ دیا۔ مسہری چرچرائی اور پھر اُس نے عدیلہ کو اپنی گود میں سنبھال لیا۔ مگر زینب کو نہ جانے کیوں اس چرچراہٹ میں ایک ماتمی سی گونج

سُنائی دی ۔ عدیلہ کے جسم نے مسہری پر بس ایک ذرا سی جگہ گھیری تھی ۔ مگر اسی جگہ پر بھی ایک اداس دباؤ سا پڑ گیا جیسے وہ جگہ اسی کے لئے بنی تھی ـــــ گویا عدیلہ اور مسہری ایک دوسرے کے ہی لئے بنے تھے ـــــ دو سالی نسب ملتے ہیں تو خود بخود یہی نتیجہ ہوتا ہے ۔

مگر اب کمرے کی فضا کچھ عجیب ہو گئی تھی ـــــ کیا مسہری کی پائینتی کچھ ایسا تاثر ڈال رہی تھی جو قبر کی دیوار معلوم ہونے لگی تھی یا قرآن مجید کی موجودگی جو اپنے گرد آلود جزدان میں لپٹا ، آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا یا غروب آفتاب کے وقت کی اداسی ؟ یا پاس کے ویران کھیت سے آتی ہوئی اُلو کی آواز ـــــ یہ اُلو تو اس علاقے سے غائب تھا پھر آج یکا یک کیسے آ گیا جیسے کسی نے صرف آج رات ہی کے لئے اسے یہاں تعینات کر کے بھیجا ہو ۔ ٹھیک ٹھیک تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا مگر محسوس تو سب کر رہے تھے کہ آج رات اس مسہری کو ایک نیا رول ادا کرنا ہے ۔ اس نے ہمیشہ بڑے سکھ ، رکھ رکھاؤ اور وضع داری سے اپنے تمام فرائض ادا کئے تھے ـــــ یہ بھی کرے گی ! آج اسے ملک الموت کی میزبانی کرنی تھی ۔ ایک روح کی پرواز محسوس کرنی تھی ۔ مرتے ہوئے ایک جسم کو اپنی آغوش میں لیکر اسے آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہوتے دیکھنا تھا ۔ آج تک اس مسہری نے زندہ انسانوں کو جنم دیا تھا ۔ انھیں تھکن اور الجھن سے نجات دی تھی اور آج اسے ایک ایسے انسان کے مُردہ جسم کی آرامگاہ بننا تھا جو زندگی کا تھکا ہوا سفر پورا کر کے منزل پر پہونچ رہا تھا ۔

ڈاکٹر نے آکر گردن توڑ بخار تشخیص کیا اور یہ کہا کہ اگر مریضہ پر رات گذر گئی تو کچھ امید کی جا سکتی ہے ورنہ .... دراصل ڈاکٹر کا مطلب یہ تھا کہ آج رات مریضہ کا انتقال ہو جائے گا ، ویسے اس نے گھر والوں کی تسلی اور اپنی فیس کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایک انجکشن بھی دیدیا تھا ۔ مگر اس کی پیٹھ

مُڑتے دیر نہیں ہوئی تھی کہ موت کا گھر آ لگ گیا۔

زینب پر جب کبھی شدید خوف اور گھبراہٹ طاری ہوتی تھی تو اُسے دست آنے لگتے تھے۔ ہوائی حملوں کے دوران بھی اس کا یہی حال ہوتا تھا۔ اِس وقت بھی یہی ہوا۔ بار بار غسل خانے اور ماں کے کمرے کے درمیان دوڑتے دوڑتے وہ بالکل پست ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماں مر بھی سکتی ہے۔ وہ گیلے ہاتھوں سے اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھتی۔ آنکھیں پھاڑے، بال بکھرائے، مسہری کے پاس کھڑی ہو کر ماں کو تکتی اور تکتی ہی جاتی ـــــ کچھ عجیب پاگل پن کے خیالات اس کے ذہن میں چکر کاٹتے۔ یکایک جیسے کوئی اُس سے کہنے لگتا ـــــ زینبؔ اگر ماں کی مہک اس مسہری میں سما گئی تو وہ مہک زندگی بھر تیرے ساتھ رہے گی پھر تو کس دل سے اس مسہری، اسی بستر پر چین سے سوئے گی، جس پر تیری ماں کو موت آئی ـــــ! تو کیا اس مسہری کو بیچ دے گی؟ مگر اب اسے خریدے گا بھی کون، اور ایسی مسہری تو اب پرانی بھی کہیں نہیں ملے گی ـــــ کیا وہ اپنی ماں کو مسہری پر مر جانے دے؟ یا یہ تسلیم ہی کرنے سے انکار کر دے کہ وہ مر رہی ہے یا پھر اپنا خیال کرے۔ آئندہ اسی مسہری پر اپنے راتوں کے سکون و آرام کو سوچے اور ماں کو اس پر سے ہٹا دے؟ ابھی تو وہ مری بھی نہیں ہے تو کیا صبح ہونے سے پہلے اُسے مُردہ تسلیم کر لے۔ اپنے ہاتھ سے اپنی ماں کی موت کی سند لکھ دے؟ مگر یہ تو بالکل طے تھا کہ اگر ماں اسی پر مر گئی تو وہ پھر وہ خود کبھی اس مسہری پر نہ سو سکے گی ـــــ اور یہ...... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تجہیز و تکفین ـــــ؟ کیا اس کی ماں واقعی مر رہی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

پو پھٹنے سے پہلے گھر اہلکا پڑنے لگا۔ اُس کی آمد و رفت کی شدت کم ہو گئی آواز مدھم پڑ گئی۔ جیسے دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹ منزل کے نزدیک پہونچکر رفتہ رفتہ ہلکی پڑنے لگتی ہے۔ اُس کی شدت میں کمی آجاتی ہے۔ اُس کی گونج مدھم ہو جاتی ہے۔

زینب نے اپنے شوہر کو بلایا اور اس سے کہا "اماں کو اٹھا کر ہال کمرے میں لیجانا چاہیئے"

شوہر نے پوچھا "کیوں، اب ایسے وقت میں اُن کو بے چین کرنے سے کیا فائدہ؟"

زینب کا دل جیسے پھٹ گیا، ایک تو اس کی ماں مر رہی تھی اور پھر اُسے یہ بھی کرنا تھا، اس کا شوہر بالکل کچھ نہیں سمجھ رہا تھا — چیخ کر بولی "تم بیوقوف ہو" پھر ایکدم پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی آہستہ سے کہنے لگی — "ایسا ہی کرنا ہوگا، پوچھو مت، سوال مت کرو، جو کچھ کہتی ہوں وہ کرو"

دونوں نے جس طرح سیدہ عدیلہ کو مسہری پر رکھا تھا اسی طرح اٹھا کر ہال کمرے کی طرف لے چلے۔ زینت ماں کے بوجھ سے دوہری ہو ہو گئی۔ مگر خیر، کسی نہ کسی طرح دونوں نے اسے زمین پر بچھی ہوئی توشک پر لٹا دیا۔ پھر زینت اپنی ماں پر گر کر زار زار رونے اور بین کرنے لگی — "اماں! خدا تمھیں اچھا کر دے — تمھیں خدا ہزار بار اچھا کرے میری ماں"

تھوڑی دیر رونے پیٹنے کے بعد وہ اٹھ کر گئی اور ایک چادر لا کر بڑے پیار سے ماں کو اڑھاتے ہوئے بڑبڑائی — "جہنم میں جائے یہ چادر۔ اِسے تو غسالہ بہر حال لے ہی جائے گی"

اور وہ صبح تک اپنی ماں کے سرہانے بیٹھی روتی اور اُس کے سفید بالوں میں

اپنی انگلیاں پھیرتی رہی — اس کا شوہر سو گیا۔ جب صبح کی سفیدی دکھائی دینے لگی تو عدیلہ کے جسم میں یکایک قوت آ گئی۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے چادر اتار پھینکی جیسے وہ اس چادر سے بچ نکلنا چاہتی ہو۔ اور کلمے کی انگلی اٹھائی ...... دونوں شہادتیں پڑھے بغیر کوئی ایماندار روح کسی طرح قفس عنصری سے پرواز کر سکتی ہے۔

ویسے تو تمام پڑوسیوں کا خیال ہے کہ زینت نے اپنی ماں کا ایسا ماتم کیا، ایسا سوگ منایا کہ گویا وہ کوئی سفید بالوں والی بڑھیا نہیں بلکہ ایک رات کی دلہن تھی جو یکایک ختم ہو گئی۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ لوگوں نے زینب کو تسکین دینے کے لئے وہ جملے نہیں کہے جو ایسے موقعوں پر کہے جاتے ہیں بلکہ اسے اپنے منھ پر طمانچے مار مار کے نیل ڈالتے دیکھ کر بس اتنا ہی کہا "جانے بھی دو زینب — ذرا کچھ اپنا بھی خیال کرو۔"

(ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر)

منگولیا ڈی میاگمار

چراغ اور پروانہ

گرمیوں کی ایک دلفریب شام تھی۔ صبح سے تو آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑہ بھی نہیں تھا مگر پھر رفتہ رفتہ سیاہ بادل اٹھنے لگے، گرج سنائی دینے لگی، کوندا آنکھوں کو چکاچوند کرنے لگا اور پھر انڈوں کے برابر برابر اولے گرنے لگے۔ زمین پر برف کی گیندیں ربر کی گیندوں کی طرح ٹپہ کھاتی اچھلنے لگیں۔ گائیں سر جھکائے دوڑتی ہوئی باڑے کی طرف لپکیں۔ بھیڑیں ایک جگہ پر اکٹھی ہو کر اور بکریوں کے ریوڑ میں ملکر ڈھیروں کی تعداد میں ایکدم رک کر بڑے صبر کے ساتھ ژالہ باری رکنے کا انتظار کرنے لگیں۔

خدا کا شکر ہے کہ بارش اور اولے جلد ہی ختم ہو گئے۔ میں سارے مویشیوں کو ہنکاتا ہوا کیمپ میں لے آیا۔ پھر سب کو باندھ بوندھ کر اپنے گیلے کپڑے اتارے، نچوڑے اور انھیں سوکھنے کے لئے آگ کے پاس پھیلا دیا۔ پھر میں چارپائی پر لیٹ گیا اور تیل کے چراغ کی روشنی میں پرانی داستانوں کی موٹی سی کتاب پڑھنے لگا جس کی جلد چمڑے کی تھی۔

قصے اتنے دلچسپ تھے کہ رات کافی گذر گئی مگر مجھے خیال ہی نہ آیا کہ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ کیمپ کی دیواروں میں کئی روزن تھے جن سے ٹھنڈی نرم ہوا اندر آرہی تھی اور بار بار چراغ کی لو کو کپکپا دیتی تھی۔ سفید پروں والا ایک ننھا سا پروانہ چراغ کی لو پر منڈلا رہا تھا، چکر کاٹ رہا تھا جیسے اسے روشنی سے دیوانہ وار عشق ہو، جیسے

اس لو کی گرمی کے علاوہ دنیا میں اور کہیں گرمی کا نام ونشان نہ ہو۔ اور میرے سامنے قصے کا یہ جملہ آیا: "دریائے سلینگا کے کنارے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے اندر سے اُبھری ہوئی اونچی اونچی سرخ چٹانیں ہیں جنھیں اسگت خان کہتے ہیں۔"

میں ان چٹانوں سے اچھی طرح واقف تھا اور مجھے یاد آیا کہ اُس دن مجھے ان چٹانوں کی بدولت کتنی پریشانی اٹھانی پڑی تھی، میری کچھ بکریاں ان پر چڑھ گئی تھیں اور چڑھنے کو چڑھ گئیں مگر اتر نہیں پا رہی تھیں۔ یہ چٹانیں ایسی سیدھی ہیں کہ ان پر کوئی چڑھ نہیں سکتا، دریائے سلینگا بھی بس ان کے قدم ہی چوم پاتا ہے۔ اور پھر ناکام لوٹ آتا ہے۔ اُس کی اونچی اونچی لہریں غراتی ہوئی، کھسیائی ہوئی مجبور ہو کر اوپر اٹھتی ہیں اور پھر گر پڑتی ہیں!

قصہ جاری تھا ـــ مغرب کے وقت ایک نہایت سحر انگیز موسیقی اسگت خان کی چٹانوں سے ابھرتی تھی اور پھر رفتہ رفتہ سارے علاقے میں اس موسیقی کی خبر پھیل گئی۔ لوگ یہاں آتے، کچھ دیر خاموش بیٹھ کر موسیقی سنتے اور واپس چلے جاتے مگر کوئی راز نہ کھلتا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر ایک دن سلینگا کے اس پار سے کچھ نوجوان آئے اور ایکدم ان کو یہ نظر آیا کہ چٹان کی چوٹی پر دو انسان ہیں ـــ ان میں سے ایک جو مرد تھا بیٹھا تھا، بالکل بے حس و حرکت اور دوسرا اپنے دونوں بازو پھیلائے اُس کے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ اُس کے بازوؤں اور قدموں میں رقص کا سا انداز تھا ـــ سلینگا پار کے نوجوان کچھ دیر تک یہ منظر دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے کہ یہ کوئی پاگل ہے۔

پھر یہ خبر اڑتے اڑتے بلدان زانگا کے بیٹے بدائی تک بھی پہونچی۔ بدائی ایک وجیہہ و حسین نوجوان تھا۔ دلیر اور بہادر، فنون جنگ میں ماہر ـــ اس کے پاس ایک عینک تھی جس کو لگانے سے دور کی چیزیں صاف دکھائی دے سکتی

تھی۔ یہ عینک اُس نے اپنے باپ دادوں سے وراثت میں پائی تھی۔ چنانچہ وہ کئی دن تک عینک لگا کر ان دونوں کو دیکھتا رہا۔

اور اس نے دیکھا کہ عین غروب آفتاب کے وقت ایک حسین لڑکی چٹان پر آئی جو ایک بوڑھے آدمی کا ہاتھ پکڑے تھی۔ بوڑھے کے ہاتھ میں ایک ساز تھا لڑکی نے بوڑھے کو چٹان کے سرے پر بیٹھا دیا اور چلی گئی۔ بوڑھا جس طرح تانبے کے بت کی طرح ساکت بیٹھا رہا، اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اندھا ہے۔ اتنے میں لڑکی پھر آگئی اور اس بار وہ سر سے پاؤں تک سفید لباس میں تھی۔ بدائی نے اسے قدیم وضع کی منگولیائی جوتیاں بھی اتارتے دیکھیں۔ پھر بوڑھے آدمی نے ساز بجانا شروع کیا اور لڑکی نے جنگلی فاختہ کی سی شبک روی کیساتھ اپنا حسین اور سحر انگیز رقص شروع کیا۔ جب تک وہ ناچتی رہی اور اُسے نظر آتی رہی بدائی اپنی نظریں ہٹا نہیں سکا ـــ جب اندھیرا اتنا بڑھ گیا کہ کچھ دکھائی ہی نہ سکتا تھا تو وہ اٹھا ـــ اور اس نے یہ طے کیا کہ کسی نہ کسی طرح وہ ان دونوں تک پہنچ کر ہی رہے گا۔

اور ایک دن اس نے ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر دریا کو پار کیا اور پھر چٹانوں پر یوں چڑھ گیا، جیسے چھپکلی، اگر ذرا بھی اس کا پیر غلط پڑتا تو دریا میں غڑاپ ہو جاتا۔ بہر حال بڑی مشکلوں میں وہ چٹان کی چوٹی پر چڑھا اور وہاں ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں چھپ گیا۔

جیسے ہی سورج غروب ہوا، وہ دونوں نکلے اور بجانے ناچنے لگے۔ وہ پتھر کی آڑ سے نکلا ـــ بدائی کو دیکھ کر وہ حسین دوشیزہ رک گئی اور پھر اندھے بوڑھے نے بھی ساز بند کر دیا۔ بدائی نے ایک قدم آگے بڑھ کر پوچھا "کون ہیں آپ لوگ؟" کمسن رقاصہ بالکل نہیں ڈری۔ بالوں کی ایک لٹ کو سنوارتی ہوئی بولی۔

"اور آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

بدائی اپنے وہاں تک پہونچ جانے پر بڑا غرور محسوس کر رہا تھا تن کر بولا "جب ایک اندھا بڈھا ان چٹانوں پر پہونچ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں پہونچ سکتا!" اور پھر بڑی شان سے کمر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے تحکمانہ انداز سے رقاصہ کو حکم دینے لگا "اچھا، اچھا — چلو ناچو!"

بوڑھا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے ساز بجانا ہی چاہا تھا کہ لڑکی نے اُسے روک دیا "نہیں، مت بجائیے!"

ساز ایکدم رک گیا، جھنا کے کے ساتھ، جیسے اس کے تار ٹوٹ گئے ہوں

بدائی نے اسی طرح کھڑے کھڑے پوچھا "آپ کیا باپ بیٹی ہیں؟"

اندھے بوڑھے کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی — "نہیں!"

بدائی نے ہوسناک نظروں سے لڑکی کو دیکھا — "تو یہ لڑکی جو پروانے کی طرح حسین ہے، تمہاری بیٹی نہیں ہے؟"

بوڑھا دھیمے سے بولا — "وہ بیشک ایک حسین پروانہ ہے جو چراغ کی روشنی کی طرف کھنچتا ہے اور اس کے چاروں طرف رقص کرتا ہے اور میں وہ چراغ ہوں جو اُسے رقص پر آمادہ کرتا ہے!"

بدائی ذرا گستاخی کے ساتھ بولا "اچھا تو یہ بات ہے، مگر بڑے میاں، شاید آپ نہیں جانتے کہ کوئی روشنی ہمیشہ قائم نہیں رہتی!"

پھر ایسا ظاہر ہوا کہ بوڑھے کو اس کی یہ بات ناگوار گذری۔ اس کے چہرے کا رنگ ڈھلک گیا، ہاتھ کانپنے لگے، اس نے تاروں پر زخمہ رکھ کر اس زور سے کھینچا کہ ایک گرجتی، غصے بھری آواز نکلی۔ بدائی کو محسوس ہوا کہ بوڑھے کو اس کی بات ناگوار گذری ہے مگر وہ ڈھیٹ بن کر بولا — "تو پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے

روشنی بجھ جائے تو پروانہ کا کیا حال ہوتا ہے"؟

"مگر آپ کیا یہ نہیں جانتے کہ چراغ اور پروانہ ایک ہی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ان کے قالب دو ہیں مگر جان ایک ہے"؟ بوڑھے نے کہا۔ اور اس نے ایکدم کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

لڑکی نے جلدی سے جوتیاں پہنیں اور کھڑے ہو کر بوڑھے کو اسی جگہ پر بٹھاتی ہوئی بولی "آپ کو غریبوں پر فقرہ بازی کرتے شرم نہیں آتی؟" "میں نے آپ سے کیا کہا۔ میں تو اس اندھے بڈھے سے بات کر رہا تھا۔ — آپ کو تو میرے متعلق اسی وقت سب کچھ معلوم ہو جائے گا جب آپ میرے گھر پہنچ جائیں گی"!

اور پھر بدائی اس بوڑھے کی طرف بڑھا — اس کا ارادہ یہ تھا کہ بوڑھے کو چٹان پر سے دھکیل دے کہ وہ پانی میں جا گرے اور ڈوب جائے۔ لیکن لڑکی بیچ میں آگئی — "آپ آخر کیوں ایک معصوم شخص کی جان لینا چاہتے ہیں"؟ بدائی بولا "آپ کو تو میں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا، میری خوشی جمال حسینہ، ابھی ہمیں ایک دوسرے کو جاننے کے لئے تو کافی وقت ہے"! اور وہ پھر آستین چڑھاتا ہوا بوڑھے کی طرف بڑھا۔

لڑکی نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا "بے ایمان، بدمعاش، سیاہ رو"! اور پلک جھپکتے میں اس نے اپنے موزوں کے اندر چھپی ہوئی لکڑی کی نیام میں سے ایک چمکتی ہوئی خنجر نما تلوار زن سے کھینچی — اس خنجر کو ہاتھ میں لئے وہ بدائی کی طرف بڑھنے لگی۔ بدائی گھبرا کے پیچھے ہٹا، اور وہ یہ بھول گیا کہ اگر وہ دو کے بجائے تین قدم اٹھائے گا تو نیچے جا پڑیگا۔ اس نے تین قدم پیچھے لئے اور نیچے دریا میں گر گیا۔

لڑکی کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور اس ہنسی کی گونج تمام وادیوں میں پھیل گئی، پہاڑوں سے ٹکرا گئی، فضاؤں پر چھا گئی، بوڑھا پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور ایک حسین نغمہ اس کے ساز سے ابھرنے لگا۔ لڑکی ہنستے ہنستے رک گئی اور بوڑھے سے بولی — "میرے رفیق اور ہمدم، کیا آپ کو معلوم ہے یہاں کیا ہوا؟"

بوڑھا مسکرایا "ہاں ہاں۔ میں سب جانتا ہوں۔ اس کے گرنے سے پانی میں جو چھپاکا ہوا وہ بھی میں نے سُنا!"

لڑکی نے پھر چوڑیاں اتار کے رکھ دیں اور کہا "میرے ہمدم آپ نے اس سیاہ رو کی بات کا جواب بالکل ٹھیک دیا۔ آپ بیشک، چراغ ہیں اور میں پروانہ، اور میرا زندگی کا کام ہی یہی ہے کہ میں چراغ کی حفاظت کروں۔ روشنی کو بچاؤں — کیونکہ میرے مہربان بزرگ، اگر آپ نہ ہوں گے تو میں بھی نہ ہوں گی۔ روشنی اور تاریکی کے درمیان کھڑا ہو جانا ہی میرا مقصد زندگی ہے اور اسی سے میں زندہ بھی ہوں۔"

جب میں نے پڑھنا ختم کیا تو مجھے یہ قدیم داستان بہت اچھی لگی اور میں سوچنے لگا کہ وہ بوڑھا اور وہ لڑکی کون تھے؟ شاید وہ نغمہ و رقص کی روحیں تھیں یا شاید ایک زندگی کی روشنی تھا اور دوسرا فن کا حسن تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں — اور ظاہر ہے زندگی کی عمر فن سے بہت زیادہ تھی مگر اب فن اتنا زیادہ طاقتور ہو گیا تھا کہ وہ زندگی کے نور کی حفاظت کرتا تھا؟.. کون جانے!

میں نے چمڑے کی جلد والی کتاب کو بند کیا اور اس کے بند کرنے سے ذرا سی ہوا پیدا ہوئی، چراغ اس جھونکے سے بجھ گیا — مگر اب چراغ کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ افق پر علی الصباح کے سنہری سورج کی کرنیں ابھر رہی تھیں۔

مگر پھر مجھے لگا یک وہ پروانہ! یا جو چراغ پر منڈلا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد رقص کر رہا تھا — وہ بھی غائب تھا!

(ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر)

نائیجیریا

سیپرین ایکوینسی

شبِ آزادی

نائیجیریا کی آزادی کی رات تھی۔ خوشیاں منانے کے لئے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ سڑکوں پر گھوم رہے تھے، خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔ ملک کے بہت سے شہروں میں بھی یہی حال تھا کہ سڑکوں پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ چینی بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھی۔

نائیجیریا کی راجدھانی لاگوس میں اور بھی زیادہ جوش و خروش تھا۔ مرد، عورتیں، بچے باتیں کرتے ہنستے بولتے یا آزادی کے نامعلوم تاثرات کے تحت کچھ بے چین، خاموش یا گھبرائے ہوئے ایک ریلے میں بہے چلے جا رہے تھے۔ ان میں وہ اجنبی اشخاص بھی شامل تھے جو افریقہ کے دور دراز کے تاریک مقامات سے اس پُر مسرت دن کی خوشیوں میں شریک ہونے راجدھانی آئے تھے اور اب بڑے چوک میں اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کئے ہوئے آتش بازی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"آج نائیجیریا آزاد تھا — آزاد نائیجیریا!
کمہ آک — کا — توآ — کمہ آک کا توآ —"

چینی فرانسوے کے اور قریب ہو گئی۔ فرانسوے نے اسے اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔
"کیسا رومان پرور سماں ہے چینی۔ بڑا ہی رومان پرور دور ہے نہ؟" فرانسوے نے کہا۔

"ہاں فرانسوے ہاں! کاش اس لمحے مجھے موت آجائے فرانسوے۔ تمہارے کاندھوں پر سر رکھے ہوئے میں ابدی نیند سو جاؤں۔ اپنے آزاد نانی جیریا پہ قربان ہو جاؤں۔"

"ہاں چینی کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش اس لمحے ہم دونوں مر جائیں تو کیا نیک شگون ہو۔" فرانسوے نے جذبات سے پُر لہجے میں کہا۔

"یہ تم دل سے کہہ رہے ہو فرانسوے۔" چینی نے اس کی نظروں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں چینی۔ یہ ہماری خوشیوں کا نقطۂ عروج ہے۔ سامراجیت کا خاتمہ ہوا ہے۔ نانی جیریا کی شروعات ہے۔ وہ دیکھو وہ آتش بازی دیکھو چینی۔"

ملکۂ ایلزبتھ دوم کا زریں تاج آتش بازی کی شکل میں نگاہوں کے سامنے تھا۔ چند لمحے وہ اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا رہا اور پھر بتدریج جل کر خاکستر ہو گیا۔

"غلامی کے سو سال ختم ہوئے۔" فرانسوے نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

چینی دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں ملکہ کا جلتا ہوا تاج ابھی تک گھوم رہا تھا۔

چینی نانی جیریا کی ایک حسین لڑکی تھی۔ سرو قد، بلند و بالا، یونانی مجسموں کے سے ڈھلے ہوئے خدوخال، تانبے کی طرح دمکتا ہوا رنگ۔ انگریزی لباس پہنتی تو بہت دیدہ زیب معلوم ہوتی اور نانی جیریائی لباس میں نہایت دل کش۔ چال ڈھال ایسی کہ فرانسوے اسے چلتا دیکھ کر بے خود سا ہو جاتا اور چینی اس کے اس تاثر کو محسوس کر کے جھینپ سی جاتی اور پھر اپنی جھینپ مٹانے کے لئے اسے "اپنا پاگل فرانسیسی محبوب" کہہ کر مخاطب کرتی۔

سڑک پہ ریل پیل جاری تھی کہ چینی فرانسوے سے لپٹ کر تقریباً چیختی ہوئی آواز میں بولی: "مجھے مار ڈالو فرانسوے مجھے مار ڈالو! مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکے گا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہزاروں آوازیں یک آواز ہو کر نانی جیریا کا قومی ترانہ گا رہی تھیں۔

"نائی جیریا ہم تیرا خیر مقدم کرتے ہیں   ہمارے اپنے پیارے وطن !!
قبیلے اور زبانیں مختلف ہوں   مگر ہم سب ایک برادری ہیں
ایک مضبوط نائی جیریائی برادری !!
جس کا ہر فرد اپنی مادرِ وطن کی خدمت کرنا اپنے لئے فخر سمجھتا ہے۔"

فرانسوے نے چینی کی ٹھوڑی اٹھا کر اس کی نرم و نازک جلد پر اپنا منہ رکھتے ہوئے کہا۔
"تم میری اپنی چینی ہو نہ ؟"

"ہاں فرانسوے، تمھاری چینی ہوں صرف تمھاری۔"

"تم میرے ساتھ پیرس چلو گی نہ اگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔" فرطِ جذبات سے فرانسوے نے چینی کو چومنا شروع کر دیا۔ اس کا منہ، آنکھیں، گال، وہ بے اختیار چوم رہا تھا۔ چینی نے بمشکل کہا۔
"دیکھو بھلا اس بھرے مجمع میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تمہیں ناگوار نہیں لگ رہا ہے چینی، مجھے معلوم ہے کچھ ہرج نہیں ہے کچھ ہرج نہیں ہے۔"
اور چینی کی سانس رک سی گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!

چینی کو وہ دوپہر یاد آ گئی جب کہ وہ ایک دن نمائش گاہ میں فرانسوے سے ملنے آئی تھی۔ میدان میں ہزاروں لوگ اپنے اپنے اسٹال بنانے کے کام میں مصروف تھے۔ چینی مجمع کو چیرتی ہوئی وہاں پہنچ گئی جہاں فرانسوے کا اسٹال تھا۔ وہ نیچے تہہ خانے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ لوہے کی سلاخیں کٹوا رہا تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا خوب صورت چہرہ پسینے سے چمک رہا تھا اور وہ تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چینی نے خاموشی کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ کیا۔ وہ مڑی ہی تھی کہ فرانسوے نے اسے دیکھ لیا۔ "چینی !"

وہ تھم گئی۔ فرانسوے نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون سے پونچھتے ہوئے اپنے دو ساتھیوں سے کچھ کہا اور پھر آرام سے قدم بڑھاتا ہوا چینی کے پاس آیا۔ اوپری زینے پر ہوا تیز تھی۔ چینی اپنی ٹوپی اور اسکرٹ کو اڑنے سے بچانے کے لئے ایک ہاتھ سے ٹوپی تھامے تھی اور دوسرے

پیا اسکرٹ۔ فرانسوے ہنس پڑا۔ "اس طرح کھڑی ہوئی تم بالکل ایک تصویر معلوم ہو رہی ہو۔"
سوے نے چینی کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھو چینی، یہ اسٹینڈ دیکھ رہی ہو۔ یہ
پوبلین میں رکھا جائے گا۔ کیسا ہے؟"
چینی نے شاید سنا بھی نہیں۔ وہ تو کھوئی کھوئی نظروں سے فرانسوے کا چہرہ دیکھنے
مشغول تھی۔ فرانسوے مڑا۔ نگاہوں سے نگاہیں ملیں۔
"خوب بہت خوب۔" فرانسوے کہہ اٹھا۔
"کیا۔؟ اسٹینڈ یا میں؟"
"تم میری جان تم۔ آؤ کافی پینے چلیں۔"
اور پھر چینی سوچنے لگی کہ "یا خدا یہ فرانسوے کیسی باتیں کرتا ہے۔ میرا تو ہر لمحے دل ڈوب
ے۔ چودہ دن میں یہ چلا جائے گا۔ نائی جیریا سے نکال دیا جائے گا۔ ہر چہار جانب سے یہی خبریں
ی ہیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خود گورنر جنرل بھی چلے جائیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ عوام
لئے ان کا نائی جیریا میں رہنا اچھا نہ ہوگا۔ تمام غیر ملکیوں کو بھی یہاں سے چلا جانا پڑے گا۔
فرانسوے کو دیکھو کس اطمینان سے کام کر رہا ہے۔ کافی پینے چل رہا ہے۔ یہاں سے جانے کا
س نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا ہے۔ کیا واقعی وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یا۔ میں نے
یا سب کچھ یوں ہی اس پر لٹا دیا!! یا خدا وہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ اسے تو ایک
رانسیسی سے محبت ہو گئی ہے جسے جلد ہی نائی جیریا سے چلا جانا ہے۔
"کچھ بولو چینی، آزادی کی آمد پہ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟" فرانسوے نے چینی کو خاموش
یکھ کر کہا تھا۔
"آزادی کا کیا کہنا! مگر ان کے لئے نہ جو واقعی آزاد ہوں۔" چینی نے جواب دیا تھا۔
فرانسوے مسکراتے ہوئے خاموش رہا۔
"اتحاد، انتقاد، وفاداری یہ سب آزادی کا جز ہیں نہ؟" چینی نے جملہ پورا کیا۔

"ہاں چینی۔ خود مجھے نائی جیریا بے حد عزیز ہے۔ افریقیوں میں تم نائی جیریائی ہی سب سے زیادہ متوازن لوگ ہو۔"

"سارے افریقی ایک ہیں فرانسوے! سفید قوموں کا مقابلہ ہو تو سارے افریقی ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔" چینی نے جواب دیا تھا۔

"گویا تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں غیر ملکی ہوں۔"

چینی خاموش رہی۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری پر رکھی تو فرانسوے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ چینی کی ٹانگیں بہت ہی خوب صورت تھیں اور آج وہ چاک دار اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ یہ چاک کمر سے لے کر نیچے تک پانچ پانچ انچ کے فاصلے پر ٹکے ہوئے بٹنوں سے بند تھے۔

"آج تمہارا موڈ نہیں اچھا ہے چینی۔" فرانسوے نے گفتگو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ چینی خاموشی سے کافی میں شکر گھلاتی رہی اور پھر پینے کے لیے پیالی اٹھائی تو اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ کافی چھلک کر اسکرٹ پر گر گئی۔ فرانسوے نے جلدی سے اپنا رومال نکال کر کافی کو اس میں جذب کر لیا۔ چند قطرے جو سینے پر گرے تھے انھیں بھی آہستہ سے صاف کر دیا۔ چینی کی طبیعت اور زیادہ اُچاٹ ہو گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرانسوے نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں ہے، ابھی دوسری کافی منگائے لیتے ہیں چینی۔"

"نہیں فرانسوے اس وقت مجھے جانے دو۔ معاف کرنا آج میری طبیعت بہت بدمزہ ہے۔ مجھے رونا آ رہا ہے۔"

فرانسوے کو خدا حافظ کہہ کر وہ اپنی موٹر کی طرف چل پڑی۔ سربلند، سرو قامت، قسمت سے ٹکر لیتی ہوئی چینی کچھ اس انداز سے چل رہی تھی کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں اٹھ جاتی تھیں۔ کئی موٹر والوں نے ہارن بجائے۔ اشارے کیے کہ "آؤ کہاں جاتی ہو؟ ہم پہنچا دیں۔" مگر چینی نے توجہ نہیں کی۔ اسے اپنے ہم وطنوں کی ہمدردی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کبھی نہیں

ھتے کہ چنی کیسی محبت کی آگ میں جل رہی ہے۔ سن پائیں گے تو خود اس کے ہم وطن اس کی مذمت
ے کو تیار ہو جائیں گے۔ خاص طور پر اس حالت میں اور نہ یادہ کہ چنی سرکاری دفتر میں ایک
ذمہ داری کا کام سنبھالے ہوئے ہے اور جس کو حاصل کرنے میں چنی نے کیا کچھ جدوجہد
ی ہے۔

خیالات کا طوفان لئے وہ چلی جا رہی تھی "مجھے فرانسوے سے محبت ہے . . !!
ں مجھے اس سے محبت نہیں ہے — وہ تو ایک فرانسیسی ہے — ! تو کیا حرج ہے . . .
یسی ہونے میں ! کیا حرج ہے . . . ! . . . ہے چنی بہت حرج ہے۔ آزادی سے
ے کوئی مضائقہ نہ رہا ہو لیکن اب . . . اب حالات بدل گئے ہیں — اب ہم میں ایک
ج حائل ہو چکی ہے، اور پھر مجھے تو اپنے آزاد ملک میں رہنا ہے۔ اس کی خدمت کرنی ہے۔
ں کی تعمیر کرنا ہے — !!"

چنی چلتی رہی۔ لاگوس کی بیس (۲۰) لاکھ آبادی کے ہزاروں لوگ پل کی سمت جا رہے
۔ چنی بھی ادھر ہی جا رہی تھی مگر وہ اس جم غفیر میں تنہا تھی۔ وہ کسی کو نہیں جانتی تھی۔

اسے یاد آیا کہ آزادی کی تقاریب میں شرکت کرنے اس کی ماں لاگوس آنے والی
ں لیکن ابھی تک آنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ خدا کرے سب خیریت ہو۔ بہتر یہ ہوگا
یں خود اپنی ماں کو سب کچھ بتا دوں۔ نائی جیریا آزاد ہے۔ اب وہ محکوم ملک نہیں ہے۔
رت کی پوزیشن بھی پہلے سے بہت مختلف ہے۔ اور محبت کے دیوتا کے سامنے تو دنیا
ا ساری عورتیں ہمیشہ ایک ہی طرح سربسجود ہوئی ہیں خواہ وہ گوری ہوں یا کالی پیلی ہوں
یلی لیکن یا خدا مجھے آخر ایک فرانسیسی سے ہی محبت کیوں ہوئی۔ میری مدد کر میرے معبود !!
ے راہ دکھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے — !!!"

ابھی کل شام کی بات ہے کہ محبت کے بارے میں چنی اور فرانسوے کے درمیان
ث ہو گئی تھی۔ فرانسوے کا کہنا تھا کہ "نائی جیریا کی لڑکیاں محبت کے معنی ہی نہیں جانتی ہیں۔

"تو تم ہی بتا دو کہ کیا معنی ہیں آخر محبت کے؟" چینی نے قدرے الجھ کر کہا تھا۔
"سمجھانا تو بہت مشکل ہے چینی۔" فرانسوے سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چینی کی نگاہ بھی
اسی طرف تھی مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔
"اس کا سمجھانا بہت مشکل ہے۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا تھا۔ "چینی محبت
کے معنی ہیں اپنے آپ کو تج دینا۔ خود کو محبت میں فنا کر دینا۔ دو انسانوں کے درمیان یہ ایک
ذاتی معاملہ ہے چینی۔"

"جی ہاں یورپ میں یہ ایک ذاتی معاملہ ہوگا، افریقہ میں نہیں۔" چینی نے چمک کر
جواب دیا تھا۔ "افریقہ میں سب سے اس کا تعلق ہے فرانسوے، میری ماں کا تعلق ہے تمام
عزیزوں کا تعلق ہے۔ میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے مگر میرے چچا زندہ ہیں۔ ان کا خاندان
ہے، ان کا بھی تعلق ہے۔ میں کوئی آسمان سے تو ٹپک نہیں پڑی ہوں۔ یہ سب میرے اپنے لوگ
ہیں، مجھ سے متعلق ہیں، مجھ سے واسطہ رکھتے ہیں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو فرانسوے۔ میں بزدل نہیں
ہوں۔ تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں جرارت نہیں ہے، ہمت نہیں ہے، میں بزدل ہوں، کمزور ہوں۔"
چینی کا منہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔
فرانسوے نے مسکرا کر چینی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ "میں سمجھتا ہوں
چینی۔ اچھی طرح سمجھتا ہوں جان۔ نائی جیریا بول رہا ہے۔"
چینی کو ناراض ہوتے دیکھ کر فرانسوے اکثر اسے چھیڑنے کے لئے یہی کہتا تھا
"کہ نائی جیریا بول رہا ہے۔" اس پر چینی بے بس سی ہو کر ہنس پڑتی تھی۔ مگر اس مرتبہ
نائی جیریا کی آزادی کے بعد فرانسوے نے قدرے تفصیل سے مگر اسی طرح چھیڑنے
لہجے میں کہا تھا کہ "دیکھو چینی، میری بات غور سے سنو۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب
نائی جیریا اپنے فعلوں کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اب آزاد نائی جیریا کو معلوم ہوگا کہ دوسروں
کی حفاظت میں رہنے اور خود اپنی حفاظت کرنے میں کیا فرق ہے۔ اب تمہیں اپنی

سماجی ادبی زندگی میں یہ فیصلہ خود کرنا ہوگا کہ کسے پہلے رکھیں ؟ خود کو یا نائی جیریا کو۔
لیکن نائی جیریا ہمیشہ تمہارے کان میں کچھ کہتا رہے گا۔ تم اگر خود اپنی آواز پہ توجہ
دو گی تو کچھ اور کرو گی ۔۔۔ اور اگر نائی جیریا کی آواز پہ کان دھرو گی تو کچھ اور۔"
جینی فرانسوے کی باتیں سن کر روہانسی ہو گئی تھی اور زچ ہو کر بولی تھی۔

"تم مجھے ہمیشہ ایسی ہی باتیں سنا دیتے ہو!"
"برا مت مانو میری جان۔" فرانسوے نے جینی کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔
"تم اس معاملہ میں اتنے تلخ کیوں ہو جاتے ہو؟" جینی نے پوچھا تھا۔
"تم تلخ نہ ہوگی جینی اگر تمہیں یہ معلوم ہو کہ تمہیں وہ ملک چھوڑنا ہے جو تمہیں بے حد
عزیز ہے اور جس سے تمہیں محبت ہے وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر پاتی۔"
"مگر فرانسوے، مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ بے پناہ محبت ہے۔"

"تو تم چلو گی میرے ساتھ۔"
"ہاں، مگر اس کا فیصلہ کرنا کس قدر مشکل ہے۔ اس وقت مجھ پر نائی جیریا کی محبت
بھی چھائی ہوئی ہے ساتھ ہی میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو۔
ہماری قسمتیں آپس میں ایسی الجھی ہیں کہ سلجھ نہیں سکتی ہیں۔"
"تو پھر بتاؤ نہ آخر کہ میں کیا کروں؟" فرانسوے کا چہرہ شدت جذبات سے
سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے جینی کو کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ جینی نے اپنے ہونٹوں پر اس کے
ہونٹوں کی گرمی محسوس کی۔ وہ گرمی جو اپنی شدت سے دونوں کو جلا کر راکھ کئے
دے رہی تھی۔
"جینی۔ جینی۔" فرانسوے کہہ رہا تھا۔ "جینی، تانبے کی سی دمکتی ہوئی عورت،
تیری رگوں میں افریقہ کا گرم خون رواں ہے۔ میں اسے سونگھ سکتا ہوں۔ میرا خون تیرے
خون کی گرمی سے بھڑک اٹھا ہے۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

ایسے تپتے ہوئے جذبات اور شعلہ فشاں محبت کے سامنے وہ بے بس ہو جاتی۔

لاگوس میں روزمرہ کی سی چہل پہل ہے بسیں ادھر سے ادھر آجا رہی ہیں جنرل ہسپتال کے سامنے میرینا پر بسوں کے اڈے ہیں جہاں نرسیں کھڑی بسوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ سامنے اسٹیٹ ہاؤس کی شاندار عمارت سورج کی روشنی میں چمک رہی ہے۔

چنی نے اپنے دفتر کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک لمبی سی کار سامنے کی سڑک پر تیزی سے گزرتی دکھائی دی۔ فرانسوے اس میں بیٹھا ہوا تھا۔

"چنی ——" افسر کی تحکمانہ آواز سن کر چنی کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کا شارٹ ہینڈ قلم تیزی کے ساتھ کاغذ پر رواں ہو گیا۔ آفس کے شاندار کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ایسا سناٹا جیسے یہ جگہ دیوتاؤں کا مسکن ہو۔

"بس اتنا ٹائپ کر کے جلدی سے لے آؤ۔" افسر نے کہا۔

چنی اپنی چیزیں جمع کر کے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ پھر آواز آئی "چنی۔"

"جی جناب۔"

"ذرا ادھر آؤ۔"

افسر کی تیوریوں پر بل تھے اور وہ اپنی فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ اس افسر کی یہ ایک خاص خصوصیت تھی کہ جب اسے کوئی کام کرنا ہوتا تو اس میں بالکل غرق نظر آتا۔ چنی کے دماغ میں خیالات تیزی سے دوڑنے لگے۔ "کیا افسر کو میرے اور فرانسوے کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ معلوم ہی ہو گیا ہو گا۔ اب کیا وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ نصیحتیں کرے گا نہیں نہیں! ہاں اور کیا۔" چنی نے ایسے سوالوں کے معقول جوابات سوچنا شروع کر دیے۔ فائلوں پر سے نگاہ اٹھائے بغیر افسر نے کہا۔

"چنی، مجھے جلد ہی دورے پر جانا ہے۔ تم جانتی ہو مس ویلز بیمار ہیں۔ میں ایک

چھی سکرٹری ٹائپسٹ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ اٹھارہ سکریٹریوں میں تم ہی سب سے
زیادہ مستعد اور بہتر شخصیت کی سکریٹری ہو۔ اس کے علاوہ تم اس سے پہلے کبھی میرے ساتھ
دورے پہ گئی بھی نہیں ہو۔"

چینی کی نگاہوں میں فرانسوے کا طنز سے مسکراتا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ "نائی جیر یا بول
رہا ہے ۔ نائی جیریا بول رہا ہے۔" ایک لمحہ کے لئے وہ بالکل بھول گئی کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا
فسر کیا کہہ رہا ہے۔ "کیا اسے نہیں معلوم کہ فرانسوے اسے طعنے دے گا۔" نائی جیریا بول رہا
ہے۔" یکایک کمرے میں خاموشی چھا گئی اور اسے احساس ہوا کہ افسر جواب کا منتظر ہے

"تم چلوگی میرے ساتھ۔"

"جی۔ جی جناب۔"

"تم میرے ساتھ دورے پہ چل سکوگی؟"

"جی جناب۔ میرا خیال ہے کہ چل سکوں گی جناب۔"

ساوُنی کی شاخوں کو ہٹاتی ہوئی چینی تیزی سے آگے بڑھی۔ کھڑکی میں روشنی دیکھ کر
اسے اطمینان ہوا کہ فرانسوے ابھی سویا نہیں ہے۔ دروازے پہ اس کا نوکر کھڑا تھا جس نے
جینی کو دیکھتے ہی کہا۔ "مالک کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

"کیا خراب ہے؟" وہ تقریباً دوڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ فرانسوے دیوار
کی طرف منہ کئے لیٹا تھا۔ چینی پلنگ پر بیٹھ گئی اور آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"فرانسوے، مجھے تم سے محبت ہے، تم میری جان ہو فرانسوے۔" چینی نے اس کے
کان میں کہا۔ فرانسوے نے چونک کر کروٹ لی اور فرط مسرت سے چینی سے لپٹ گیا۔ پھر اس نے
دیکھا کہ چینی اپنے نوی لباس میں ملبوس ہے۔ رنگ آسمانی ہے جو کہ فرانسوے کا پسندیدہ رنگ ہے۔

"پیاس لگی ہے چینی، کچھ پینے کو نہیں دوگی۔" فرانسوے نے کہا۔ چینی مسکرائی۔ وہ

سمجھ گئی کہ اس بہانے سے وہ اسے چلتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ جینی کی چال پر فدا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کاش میں شاعر ہوتا تو تمہاری چال کی تعریف میں ایسے قصیدے لکھتا۔ ایسے لازوال ادب پارے جنھیں سن کر لوگ ہمیشہ سر دُھنتے رہتے۔"

جینی فرج سے پانی لائی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ یکایک فرانسوے نے اپنا ہاتھ جینی کے گال پر رکھ دیا۔ ہاتھ بھٹی کی طرح جل رہا تھا۔ جینی نے دیکھا کہ فرانسوے کا چہرہ بھی تمتمایا ہوا ہے، اسے بخار ہے۔

"تم بیمار ہو فرانسوے۔"

"ہاں تمہارا بیمار ہوں جینی۔ تم جانتی ہو جینی میرا جی چاہتا ہے کہ میں بس یہیں مر جاؤں۔ تمہاری محبت دل میں لئے ہوئے تمہارے ہی ملک میں، تمہارے نائی جیریا میں دفن ہو جاؤں۔ سُن رہی ہو جینی۔ ہاں، تم نے کچھ فیصلہ کیا؟"

"تمہارے ساتھ فرانس جانے کا؟"

"ہاں۔ تو تم چل رہی ہو نہ؟"

"~~میں چلنا تو چاہتی ہوں فرانسوے۔~~ میں چلنا چاہتی ہوں مگر..."

"مگر... نائی جیریا بول رہا ہے۔" فرانسوے نے آہستہ سے کہا۔

جینی یہ طنز برداشت نہ کر سکی۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ "مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو فرانسوے۔ نائی جیریا بول رہا ہے، ہاں نائی جیریا بول رہا ہے، مگر تمہاری آواز نائی جیریا کی آواز سے بلند ہے۔ میں اسے سن رہی ہوں۔ وہ میرے کان میں گھُلی ہوئی ہے فرانسوے۔ تم مجھے محبت سے پکار رہے ہو۔ میں سن سکتی ہوں فرانسوے میں اسے سُن سکتی ہوں۔"

فرانسوے نے بخار کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اب اس کا چہرہ پرسکون نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ جینی کے دماغی ہیجان نے پھر کروٹ لی۔ یا خدا مجھے

خص سے، اس فرانسیسی سے کیوں محبت ہوگئی۔ ! ! آخر اور لوگ بھی تھے جو مجھ پہ
جتے تھے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے ! ! مگر ہائے میں تو ایک فرانسیسی پہ مرمٹی۔"

اسے ابیادے یاد آگیا۔ یونی ورسٹی کے پہلے سال میں وہ جینی پہ بری طرح عاشق
یا تھا۔ ہر وقت وفاداری کے ثبوت میں گویا ہاتھ جوڑے کھڑا رہتا تھا۔ جینی اس سے
تہ بھی ہوگئی تھی اور اسے لطف بھی آتا۔ مگر پھر وہ اسی سال لندن چلی گئی۔ لندن میں
لے نرپٹ مین (Pit mans) کورس کی ٹریننگ حاصل کرنا شروع کر دی۔
یادے کے محبت بھرے خطوط آتے رہے۔ جینی جواب بھی دیتی رہی لیکن ساتھ ہی
ں کے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑتی رہی کہ وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ تفریح کرتا
پھرتا ہے۔

جینی کورس پورا کر کے لندن سے اپنے وطن واپس پہنچ گئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔
رے لاگوس پر غنودگی سی چھائی ہوئی تھی۔ بجلی گھر کا مینار اور دوسری جانی پہچانی
رتوں کو دیکھ کر جینی کا دل بھر آیا۔ آگے نگاہ کی تو ابیادے کھڑا ہوا تھا۔ ابھی کل رات
ں کو اس کے محبت بھرے خطوں کو بڑی دیر تک پڑھتی رہی تھی۔ لیکن جینی کو بعد میں اس کا
م ہوا کہ وہ ان دنوں ایک دوسری لڑکی سے محبت کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ جینی اس کے
طوں کو ابھی تک اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتی تھی۔ پھر ایک دن وہ مرینا پیریلوں ہی ٹہلنے
ل گئی۔ خطوط بدستور ہینڈ بیگ میں موجود تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ ساحل پر روشنیاں
جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ وہاں ملک ملک کے جہاز لنگر انداز تھے۔ بہت ہی دلکش
سماں تھا۔ یکایک جینی کو اپنی ناکام محبت کی داستان یاد آگئی اور اس نے غیر ارادی
طور پر خطوں کا پلندہ سمندر میں پھینک دیا۔

جب جینی کو پہلی ملازمت ملی تو دفتر کا ایک نوجوان ڈاکٹر اسے دفتر سے گھر تک

اور گھر سے دفتر تک اپنی موٹر میں پہنچانے لگا۔ یہ بس یوں ہی ہو گیا۔ اس عمل کے پیچھے کوئی ارادہ یا منصوبہ پوشیدہ نہیں تھا۔

ایک شام بی وائی ڈبلیو سی اے میں اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑی تھی کہ ایک لڑکی نے آواز دی۔ "چینی چینی یہاں آؤ۔ وہ دیکھو وہ تمہارا لمبے پائپ والا دہ کھڑا ہوا ہے۔" چینی وہاں آئی تو دیکھا کہ سڑک کے اُس پار کے پٹرول کے پمپ پہ ڈاکٹر کی کار کھڑی ہے مگر کچھ اس طرح کہ کھڑکیوں سے صاف نظر نہ آئے۔ موٹر میں ڈاکٹر کے برابر ایک عورت بیٹھی تھی اور پیچھے کی سیٹ پر تین چھوٹے چھوٹے بچے۔ دو لڑکے اور ایک منی سی پیاری لڑکی جس کے بالوں میں سرخ ربن لگا ہوا تھا۔

دوسرے دن چینی وقت سے پہلے ہی آفس چلی گئی تاکہ ڈاکٹر کے ساتھ بدمزگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن وہ حضرت شام کو وائی ڈبلیو سی اے پہنچ ہی گئے۔ اس نے انھیں نشست گاہ میں بٹھایا اور پھر فوراً کہا کہ "آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔" ڈاکٹر سٹپٹا سا گیا۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا پھر قدرے جھجکتے ہوئے اس نے کہا، "میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔" چینی نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کو اس میں کوئی معیوب بات نظر نہیں آتی۔ دنیا میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

"کیا میں آپ کو ایسی ہی لڑکی معلوم ہوئی جو شادی شدہ مردوں سے دوستی کرتی پھرتی ہے؟"

"نہیں نہیں چینی میں آپ کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ مجھے صرف دھوکا دینا چاہتے تھے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

ان باتوں کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ اس وقت وہ فرانسوے کے پاس اس کے پلنگ پہ

بیٹھی ہے، اسے تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ وہ تھوڑی دیر بعد جینی کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

جینی کو یاد آیا کہ فرانسوے سے اس کی ملاقات کس قدر غیر معمولی حالات میں ہوئی تھی۔ لاگوس میں افریقی کلچر سے متعلق ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ بس وہاں دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔

کانفرنس کے ایر کنڈیشنڈ ہال میں فرانسوے نے اپنی تقریر شروع کی۔ بہت سلجھے انداز سے اور ٹھنڈے ٹھنڈے۔ لیکن بتدریج اس کی آواز میں جوش پیدا ہوتا گیا اور الفاظ تیزی سے اُبلنے لگے۔ جینی کو اپنے شارٹ ہینڈ کی رفتار بھی تیز کرنی پڑی۔۔!! وہ کہہ رہا تھا:

"اسی وجہ سے ہمیں اس نتیجے پر پہنچنا پڑا ہے کہ سامراجی طاقتیں ہمارے لئے عجیب دور رُخے حالات چھوڑ گئی ہیں۔ ایک جانب وہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو ظاہری ٹیم ٹام سے پوری طرح لیس ہے لیکن اندر سے کھوکھلا ہے اور دوسری جانب وہ پست علاقے ہیں جو پوری طرح سامراجی طاقتوں کے دست نگر تھے اور جن کی ترقی کی طرف حکومت نے کبھی کوئی توجہ نہیں کی۔ یہ حالات سامراجی طاقتوں کے اس دعوے کا پول کھول دیتے ہیں کہ افریقی تہذیب یا کوئی بھی تہذیب خود اپنا تحفظ کر سکتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم ۔ ۔ ۔ ۔"

چائے کا وقفہ ہوا تو نمائندے مختلف گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ جینی بھی اٹھ کر کتابوں کی طرف آ گئی اور بڑی توجہ سے نایاب، اور نادر نسخوں کو دیکھنے لگی۔ اتنے میں پاس سے کسی نے مخاطب کیا۔ انگریزی اور فرانسیسی کے ملے جلے لہجے میں فرانسوے کچھ کہہ رہا تھا۔ جینی نے گردن ہلائی۔ اس کی تہذیب کا تقاضا تھا کہ وہ یہ نہ معلوم ہونے دے کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی ہے۔ فرانسوے بولے جا رہا تھا، اس کا لب و لہجہ بہت ہی دل کش تھا۔ آواز بھی ایسی جیسے کانوں میں رس گھل رہا ہو۔ جینی توجہ دینے پر مجبور ہو گئی۔ اب وہ کچھ کچھ اس کی گفتگو سمجھنے بھی لگی۔ دونوں غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ہو گئے اور کتابوں کے پاس سے چلتے ہوئے کافی روم میں پہنچ گئے اور

پھر کافی پیتے پیتے نہ جانے کس نامعلوم طاقت کے تحت ایک دوسرے کے دلوں تک پہنچنے لگے۔ خود اپنی باتیں ہونے لگیں۔ فرانسوے سرخ رنگ کی قمیص پہنے تھا جس میں وہ بہت جاذب نظر نظر آ رہا تھا۔ وہ دراز قد تھا اور مردانہ حسن کا ایک مکمل نمونہ۔ چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ ان پروفیسروں، ناقدوں، علم الاقوام کے ماہروں اور مبصروں کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے جو افریقی تہذیب سے متعلق اس بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

چونکہ یہ بین الاقوامی کانفرنس تھی اس لئے کانفرنس میں زیادہ تر لوگ مختلف قسم کے عجیب عجیب لباسوں میں ملبوس تھے۔ خود جینی نے آج بڑی کاوش کے ساتھ اپنا بناؤ سنگار کیا تھا لیکن یکایک فرانسوے کے ساتھ بیٹھے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ بنی سنوری ہے۔ گرد و پیش نگاہ کی تو ایک اور خاتون نظر آئیں جو سنگار پٹار میں جینی کو بھی مات کر رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر جینی کو قدرے اطمینان ہوا۔ پھر یکایک اسے محسوس ہوا کہ فرانسوے کچھ پوچھ رہا ہے۔ اس نے بغیر زیادہ توجہ دیتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں میں سکریٹری ٹائپسٹ ہوں۔ ہمارے یہاں اٹھارہ سکریٹری ہیں۔"

"کیا آپ ہمیشہ انگریزی بولتی ہیں ؟"

"جی ہاں۔"

"کیا آپ کچھ لکھتی بھی ہیں ؟"

"جی نہیں دوسروں کی لکھی ہوئی چیزیں پڑھتی ہوں۔ یہاں مجھے کانفرنس کی کارروائی ریکارڈ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ نہیں، میں لکھتی نہیں ہوں، پڑھتی ہوں، مجھے رومانی کہانیاں بہت پسند ہیں۔"

فرانسوے کا چہرہ سرخ ہو گیا اور جینی سوچنے لگی کہ شاید اس نے کوئی غلط قسم کی بات کہہ دی ہے۔ پھر اپنی بات کو نباہنے کے لئے اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"پہلی رومانی کہانی مجھے بہت پسند آئی۔ اس کا عنوان تھا "محبت کان میں کچھ کہتی ہے"۔"

"جی جی ۔ مجھے یہ کہانی پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔" فرانسوے نے جواب دیا۔ "بہت زمانے کی بات ہے۔ میں کانونٹ میں پڑھتی تھی، اس وقت کی بات ہے۔!! مگر مجھے آج تک پوری کہانی یاد ہے۔" یہ کہہ کر جینی نے کہانی سنانا شروع کر دی۔ ابھی آدھی کہانی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسے یکایک خیال آیا کہ وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں بیٹھی ہوئی ہے جہاں ایسی کہانیاں سنانا کس قدر بے تکی بات ہے۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور چند لمحوں کے لئے فضا میں عجیب خلا سا پیدا ہو گیا۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور فرانسوے اور جینی کافی روم سے اٹھ کر کانفرنس ہال میں اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے۔ یہ تھی جینی اور فرانسوے کی پہلی ملاقات جو بڑھ کر محبت بن گئی، ایسی محبت جس کے شعلوں نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جینی اب بھی قابلیت اور مستعدی سے کام انجام دیتی ہے۔ اس درجہ مستعدی سے کہ افسر کبھی کبھی کہہ اٹھتا ہے کہ "جینی تم بہت کام کرتی ہو، تمہیں آرام کی ضرورت ہے، تم کچھ دنوں کے لئے چھٹی کیوں نہیں لے لیتی ہو۔"

جینی ایک مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتی۔ "شکریہ جناب شکریہ، اگر مجھے کام کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔"

جینی کا یہ جواب سن کر اس کا افسر اپنی سگریٹ کو راکھ دان میں مسل کر بجھا دیتا، اس کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے اور وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے جینی کے جواب نے اس کے دل کی گہرائیوں میں کسی دکھتی رگ کو چھو لیا ہے۔

"کیا میں جا سکتی ہوں؟"

افسر کے چہرے پر پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتی اور وہ کہنا شروع کرتا۔ "جینی دنیا میں سب ہی کو کسی نہ کسی بدقسمتی سے دوچار ہونا پڑتا ہے مگر اس نے

یہ معنی تھوڑی ہیں کہ انسان پھر اپنے آپ کو ختم کر دے، اپنی زندگی تج دے۔ فرانسوئے کی موت ہو گئی، اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اس سے محبت تھی۔ مگر۔ مگر بدقسمتی کا آخر کیا علاج ہے۔"

جینی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور وہ کھڑے رہنے کی تاب نہ لا کر پاس کی کرسی پر بیٹھ جاتی۔

"جینی! تم اس طرح اپنے آپ کو کام میں لگائے رکھتی ہو۔ ٹھیک ہے۔ مگر ساتھ ہی لوگوں سے ملو، میل ملاپ بڑھاؤ، کہیں آؤ جاؤ۔ اب کیا تم کسی اور سے محبت نہیں کر سکتیں۔ دنیا میں اور بہت سے اچھے لوگ ہیں۔۔۔۔ اوفہ!

افسر یکایک جھنجلا کر خاموش ہو جاتا۔ یہ وہ شخص تھا جس کی تقریر کے لئے کہا جاتا تھا کہ اس میں جادو بھرا ہے۔ جب وہ بولتا تو ہر سننے والا خود کو اس کا ہم خیال محسوس کرنے لگتا۔ مگر یہاں جینی سے وہ جب باتیں کرتا تو ایسا احساس ہوتا کہ جیسے وہ کسی دیوار سے گفتگو کر رہا ہو۔ جینی پر مطلق کوئی اثر نہ ہوتا۔ اُس جینی پر جو اس کی اپنی ٹائپسٹ لڑکی ہے۔

اُدھر جینی کو ایسا معلوم ہوتا کہ دور بہت دور پر کوئی بولے جا رہا ہے، بولے جا رہا ہے لیکن ساری گفتگو بے ربط ہے، بے معنی ہے — اس کی لازوال محبت دونوں کے درمیان اس طرح حائل تھی کہ جینی کے کانوں تک افسر کی آواز پہنچنا تو درکنار وہ اس کو نظر تک نہ آتا تھا۔

کرشن چندر ہندوستان

دانی

دانی لمبا اور بدصورت تھا۔ اس کی ٹانگوں اور باہوں پر بال کثرت سے تھے اور بہت کھردرے تھے۔ صبح سویرے چارک روڈ کے ہائیڈ ریسٹ پر ٹہلتے ہوئے وہ دور سے دیکھنے والوں کو بالکل بھینس کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم میں واقعی ایک بیل کی سی طاقت تھی۔ اس کا سر بڑا، ماتھا چوڑا، اور کھوپڑی بڑی مضبوط تھی۔ دن بھر وہ چارک روڈ کے ناکے پر ایرانی ریستوران میں بڑی مستعدی سے کام کرتا اور رات کو ٹھرا پی کر ایک مینڈھے کی طرح سر نیچا کرکے ہر کس و ناکس سے کہتا "آؤ میرے سر سے ٹکر مارو!" مگر یار لوگ ہنس کر طرح دے جاتے تھے۔ کیونکہ دانی کا سر ہی نہیں اس کا جسم بھی بے حد مضبوط تھا۔ دو تین بار نتھو کالین اور ڈورا گلی کے چند کسرتی نوجوانوں نے اس کا چیلنج منظور کرتے ہوئے اسے ٹکر پر گھیرا اور نتیجے میں اپنے سر پھڑوا کر چلے گئے تھے۔ پھر کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ دانی کے سر سے ٹکر لے سکے۔

غالباً دانی کے سر میں ہڈی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر مغز کا گودا ہوتا تو وہ بآسانی تھوڑی سی عقل صرف کرکے بمبئی کا دادا بن سکتا تھا۔ اس سے کم ڈیل ڈول اور طاقت والے نوجوان اپنے اپنے علاقوں کے ذی اثر دادا بن چکے تھے اور غنڈوں کی پلٹنوں پر حکومت کرتے تھے۔ شراب اسمگل کرتے تھے۔ سٹہ کھلاتے تھے۔ سینما کے ٹکٹ بلیک میں بیچتے تھے۔ رنڈیوں کے کوٹھے چلاتے تھے اور الیکشن کے موقعے پر اپنے علاقے کے ووٹ بیچتے تھے۔

مگر شاید دانی کی کھوپڑی میں بھیجا نہ تھا۔ کیونکہ اسے اس قسم کے تمام کاموں سے الجھن سی ہوتی تھی جب کوئی اسے اس قسم کا مشورہ دیتا تو اس کے چہرے پر شدید بیزاری کے اثرات

نمایاں ہو جاتے اور وہ کہنے والے کی طرف اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی کر کے ہونٹ بھینچ کے سر جھکا کے۔ کندھے پکڑ کے ایک حملہ کرنے والے مینڈھے کی طرح خطرناک پوز بنا کر کہتا" پھر ایسا بولا تو ٹکر ماروں گا"!

اور مشورہ دینے والا کھسیا کر یا ہنس کر پرے ہٹ جاتا۔

دانی کو پڑھنے سے نفرت تھی۔ وہ تعلیم یافتہ آدمیوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا

دانی کو شہرت سے نفرت تھی۔ جب کبھی کسی بڑے اور مشہور آدمی کا جلوس چارک چوک سے گذرتا اور اس عظیم الشان ہستی کو پھولوں میں لدے ہوئے، ایک کھلی کار میں بیٹھے ہوئے، دور دیہ ہجوم کی سلامی لیتا ہوا دیکھتا تو کہتا۔

"واہ۔ کیا سجا ہوا مینڈھا ہے۔ اس سے پوچھو، میرے سر سے ٹکر لے گا؟"

واقعی ذرا غور کرو تو صرف جنگ آزادی کے دنوں میں دبلے پتلے لیڈر آتے تھے آج کل جوں جوں عوام کی حالت پتلی ہوتی جاتی ہے۔ لیڈر موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اس قدر لحیم شحیم اور موٹے تازے دستیاب ہوتے ہیں۔ آج کل کہ ان پر بہ آسانی کسی مینڈھے یا ناگوری بیل کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

دانی کو سیاست سے بھی سخت نفرت تھی۔ اونچی سیاست تو خیر اس کے پلے ہی نہ پڑتی تھی۔ لیکن وہ جو ایک سیاست ہوتی ہے۔ گلی، محلے، بازار اور ریستوران کی، وہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بس اسے صرف کام کرنا پسند تھا۔ حالانکہ دانی مسلسل سولہ گھنٹے کام کرنے کیلئے تیار رہتا۔ مگر ریستوران کا مالک بھی کیا کرے وہ قانون کے ہاتھوں مجبور تھا اور دانی اپنی فطرت کے ہاتھوں۔ اس لئے وہ صبح سویرے سب سے پہلے ریستوران میں آتا اور سب نوکروں کے بعد جاتا اور دن بھر کھڑے کھڑے وہ کم از انتہائی چوکسائی سے سب کام سب سے پہلے کرتا اور جب ریستوران بند ہو جاتا اور دن بھر کی مشقت سے بھی دانی کا جسم نہ تھکتا تو وہ انتہائی بے آرام ہو کر ٹھرا پی لیتا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر اپنے دوستوں سے ٹکریں لڑانے کو کہتا اور جب کوئی تیار نہ ہوتا تو

وہ مایوس ہو کر اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیتا اور فٹ پاتھ پر گر کر سو جاتا۔ بس یہی اس کی زندگی تھی۔

جس رات ثریا کو اس نے غنڈوں کے ہاتھوں سے بچایا تو اسکو بھی اُسکے دوست علی اکبر نے منع کیا تھا۔ تین چار غنڈے مل کے ثریا کو ایک ٹیکسی میں بھگانے کی کوشش کر رہے تھے جو چرچ کے سامنے جنگلے سے باہر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی تھی۔ چوک کا سپاہی ایسے موقع پر کہیں گشت لگانے چلا گیا تھا جیسا کہ ایسے موقعے پر اکثر ہوتا ہے۔ ثریا خوف اور دہشت سے چلا رہی تھی اور مدد کے لئے پکار رہی تھی اور علی اکبر نے دانی کو بہت سمجھایا تھا۔ یہ بمبئی ہے۔ ایسے موقعوں پر یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ ایسے موقعے پر سب لوگ کان لپیٹ کے سو جاتے ہیں۔ تم بھی سو جاؤ۔ حماقت مت کرو۔ مگر دانی اپنے کانوں میں انگلیاں دینے کے باوجود ثریا کی چیخوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیکسی کی جانب بھاگا۔ غنڈوں کے قریب جا کے اس نے اُن سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ اس نے سر نیچا کر کے ایک غنڈے کے سر میں ٹکر ماری۔ پھر دوسرے کے، پھر پلٹ کے تیسرے کے۔ اگلے چند لمحوں میں تینوں غنڈے فرش پر پڑے تھے اور ان کے سر پھٹ گئے تھے۔ پھر پلٹ کر دانی نے چوتھے غنڈے کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے ثریا کو فٹ پاتھ پر چھوڑ کر ٹیکسی کے اندر کود گیا۔ اور ٹیکسی والا گاڑی اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا۔ دانی مینڈھے کی طرح سر نیچا کر کے ٹیکسی کے پیچھے بھاگا مگر موٹر کا پہیہ بہت تیز رفتار ہوتا ہے اس لئے دانی مایوس ہو کر پلٹ آیا اور واپس آکر ثریا سے پوچھنے لگا۔

"یہ لوگ کون تھے؟"

"ایک تو میرا بھائی تھا"۔ ثریا نے سسکتے سسکتے کہا۔

"تمہارا بھائی تھا؟" دانی نے پوچھا۔

"ہاں"، ثریا نے سر ہلا کر کہا "وہ مجھے ان غنڈوں کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا"۔

"کتنے روپیوں میں؟"

"تین سو روپیوں میں"۔ ثریا نے جواب دیا۔

"پھر؟"

"پھر بی نہیں مانی۔"

"تم کیوں نہیں مانیں؟"

"میں چھ سو مانگتی تھی۔"

"تم چھ سو مانگتی تھیں!" دانی نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"میرا بھائی تین سو روپے لیجاتا تو مجھے کیا ملتا۔ میں جو بک رہی تھی تو مجھے بھی کچھ ملنا چاہئے تھا۔" ثریا نے دانی کو سمجھایا۔

دانی خفا ہو کے بولا۔ "واہ! جو چیز بیچی جاتی ہے اسے کیا ملتا ہے؟ ایسا دستور تو ہم نے زندگی میں کہیں نہیں دیکھا نہ سنا۔ ہماری دوکان سے جو گاہک چار آنے کا کھارا بسکٹ خریدتا ہے۔ اسے چار آنے کے عوض کھارا بسکٹ ملتا ہے۔ دوکاندار کو چار آنہ ملتا ہے مگر کھارا بسکٹ کو کیا ملتا ہے؟ ایں؟"

"میں کھارا بسکٹ نہیں ہوں۔" ثریا غصے سے بولی۔

دانی نے سر سے پاؤں تک ثریا کو دیکھا۔ جوان، تیز، تیکھی اور نمکیلی اور سانولی۔ بولا۔ "مگر بالکل کھارا بسکٹ کی طرح لگتی ہو۔"

ثریا مسکرائی، کچھ شرمائی۔ اگر وہ ساڑھی پہنے ہوتی تو ضرور وہ اس وقت اس کا آنچل اپنے سینے پر لے لیتی کہ ایسے موقعوں پر عورتوں کی ایک ہیٹینٹ ادا ہوتی ہے مگر اس بیچاری نے تو سیاہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس لئے اس نے صرف گردن جھکانے پر اکتفا کی۔

دانی پلٹ کر فٹ پاتھ پر اپنی جگہ پر آگیا اور بولا۔ "اچھا اب جاؤ۔ کہیں دفع ہو جاؤ۔"

ثریا اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولی — "مجھے بھوک لگی ہے۔"

ایرانی کا ریستوران تو بند ہو چکا تھا۔ اس لئے دانی اس کے لئے دور اگلی گلی کے ایک چائے خانے سے دو پاؤ اور آملیٹ اٹھا لایا۔ اور جس طرح سے ثریا نے اسے کھایا، اس سے معلوم

ہوتا تھا کہ اس کی بھوک میں بھی دانی کا اسٹائل جھلکتا ہے۔ دو لقموں میں وہ چار سلائس کھا گئی۔ ایک لقمے میں آملیٹ۔ پھر اس نے ایک ہی گھونٹ میں ساری چائے حلق سے نیچے اتار دی۔ دانی اُس کی اِس حرکت پر بے حد خوش ہوا۔ یکایک اسے محسوس ہوا جیسے اُسے ایک جگری دوست مل گیا۔ بولا ــــ

"تمھیں بہت بھوک لگتی ہے ؟"

"بہت !"

"تمھارا نام کیا ہے ؟" دانی نے اب پہلی بار اُس سے نام پوچھا۔

"ثریا یعنی سوسنا !" ثریا جھجکتے جھجکتے بولی۔

"میں دانی ہوں" دانی اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "یعنی ڈینیل"

پھر وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور یکایک پہلی بار انھیں آسمان بہت صاف دکھائی دیا۔ اور دور سمندر سے نغمے کی صدا آنے لگی اور میٹھی گداز رات گل مہر کے پھول پہنے ان کے ترسے ہوئے جسموں کے قریب سے گذرتی گئی۔

روز رات کو فٹ پاتھ پر دانی اور سریا کا جھگڑا ہوتا تھا کیونکہ دانی نے سریا کو ایرانی ریستوران کے کچن میں نوکر کرا دیا تھا۔ پہلے تو اس نے کئی دن تک سریا کو فٹ پاتھ سے بھگانے کی کوشش کی۔ وہ سینڈ کی طرح سر جھکا کے جب ثریا کی جانب رخ کرتا تو سریا وہاں سے بھاگ جاتی اور دانی کے سو جانے کے بعد واپس اسی فٹ پاتھ پر چلی آتی اور ہولے ہولے اس کے پاؤں دابنے لگتی۔ اور جب صبح سویرے دانی اٹھتا تو اُسے اپنا بدن بہت ہلکا، عمدہ اور مضبوط معلوم ہوتا۔ اور وہ دیکھتا کسی نے اس کی بنیائن دھو دی ہے اور قمیض و پتلون بھی۔ تو پہلی بار اُسے زندگی میں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنے گھر میں آگیا ہو۔ پہلی بار اُس نے سریا کی انگلیوں کو ایک انوکھے انداز میں دیکھا ... وہ دیر تک اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر راتوں کو اسے فٹ پاتھ پر اپنا بستر اور تکیہ لگا ہوا ملنے لگا۔ اور وہ جگہ بھی صاف ستھری اور مسلسل جھاڑ پونچھ سے

چمکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ جہاں وہ ہر روز سوتا تھا اور وہ ثریا کے وجود کا عادی ہوتا گیا۔ مگر اب بھی ہر روز کھانے کے وقت رات کو فٹ پاتھ پر دونوں کی لڑائی ہوتی تھی کیونکہ ثریا بھی بہت کھاتی تھی اور دانی بھی۔ دونوں رات کا کھانا ریستوران سے لے آتے تھے اور مل کر کھاتے تھے۔ اور دونوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کون کس سے زیادہ کھاتا ہے۔ اکثر اوقات دانی کامیاب رہتا تھا لیکن جس دن ثریا زیادہ کھانے میں کامیاب ہو جاتی تھی اس دن وہ دانی کے ہاتھ ضرور پٹتی تھی۔

ایک دن ثریا نے دانی سے کہا۔

"اب تم مجھے مت پیٹا کرو۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اب میرے بچہ ہونے والا ہے۔" ثریا نے اُسے سمجھایا۔

دانی نے یکایک کھاتے کھاتے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ حیرت سے ثریا کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"بچہ!"

"ہاں!" ثریا خوش ہو کر بولی۔

"وہ بھی کھائے گا؟" دانی کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ خفیف سی مایوسی بھی تھی۔

"ہاں وہ بھی کھائے گا۔" ثریا نے اُسے سمجھایا۔ "پہلے تو میں ایک تھی۔ اب دو ہوں۔ ایک میں، ایک میرا بچہ، تمہارا بچہ پیٹ میں۔ اب ہم دو ہیں۔ ہم دونوں کو زیادہ روٹی ملنی چاہیئے۔"

دانی نے اپنے سامنے فرش پر پڑے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے پر کھانے کو دیکھا۔ پھر اُس نے ثریا کو دیکھا۔ پھر اُس نے اپنا منہ بڑی سختی سے بند کیا اور دونوں جبڑوں کو ہلا کر اس طرح جنبش کی، جیسے وہ مایوسی کا ایک بہت بڑا لقمہ نگلنے جا رہا ہو۔ پھر اُس نے آہستہ سے کاغذ کا ٹکڑا ثریا کی جانب بڑھا کر کہا۔

"تم کھاؤ۔"

"نہیں، تم بھی کھاؤ۔ تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔" سُرپا نے کہا۔

"نہیں، پہلے تم کھالو۔ بعد میں جو بچے گا وہ میں کھاؤں گا۔" دانی نے ایک عجیب ملائمت سے کہا۔

پہلے دن تو سُرپا سب چٹ کر گئی۔ اس زور سے بھوک لگی تھی اسے۔ دوسرے دن اُس نے کچھ تھوڑا سا چھوڑا دانی کے لئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ دانی کے لئے زیادہ کھانا چھوڑنے لگی۔ پھر بھی جو باقی بچا تھا وہ دانی کے لئے اس قدر کم ہوتا تھا کہ اس کی آدھی بھوک تشنہ ہی رہ جاتی تھی لیکن اب اس نے خالی پیٹ یا آدھے پیٹ رات کو بھوکے سو جانا سیکھ لیا تھا۔ پرانی عادت کو واپس بلانا اس قدر مشکل نہیں ہوتا جس قدر نئی عادت کو پالنا۔ ہوتے ہوتے اس نے شراب پینا چھوڑ دیا کیونکہ بچے کو خوراک چاہیئے اور کپڑے بھی۔ اور سُرپا نے ابھی سے اپنے بچے کے لئے کپڑے سینے شروع کر دیئے تھے۔ چھوٹے سے ننھے سے گدے کے کپڑے رنگ دار ملائم اور ریشمی جن پر ہاتھ پھیرنے سے دانی کے جسم اور روح میں مسرت اور شادمانی کی پھریریاں سی گھومنے لگتی تھیں۔ "ہمیں زیادہ سے زیادہ بچانا چاہیئے۔" کئی دنوں کے سوچ بچار کے بعد دانی اس نتیجہ پر پہونچا۔

رات کے بارہ بجے تھے اور اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر ایک دوسرے کے قریب لیٹے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

"مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں کوئی دن ایسا یاد نہیں آتا جس دن میں بھوکا نہیں نہیں رہا۔" دانی بولا۔

"میں کوئی رات ایسی یاد نہیں کر سکتی، جب میں کھانا چرانے کے الزام میں نہ پٹی ہوں۔" سُرپا بولی۔

"مگر ہمارا بچہ بھوکا نہیں رہے گا۔" دانی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اُس کے پاس سب کچھ ہوگا" سریا نے پر امید لہجے میں کہا۔

"پیٹ بھرنے کے لئے روٹی، تن ڈھکنے کے لئے کپڑا" دانی خوابناک لہجے میں بولا۔

"اور رہنے کے لئے گھر" سریا بولی۔

"گھر؟" دانی نے چونک کر پوچھا۔

"کیا اپنے بچے کو گھر نہ دوگے؟" سریا نے شکایت کے لہجے میں پوچھا۔ "کیا وہ سی فٹ پاتھ پر رہے گا؟"

"مگر گھر کیسے مل سکتا ہے؟" دانی نے پوچھا۔

"میں نے سب معلوم کر لیا ہے" سریا نے سمجھایا۔ "چرچ کے پیچھے نورا مینشن بن رہی ہے۔ اس میں پانچ کمرے والے فلیٹ بھی ہونگے اور چار کمرے والے اور تین کمرے والے، دو کمرے والے اور دس فلیٹ ایک کمرے والے بھی ہوں گے جن کا کرایہ ستر روپیہ ہوگا اور پگڑی سات سو روپے۔"

"مگر سات سو روپے ہم کہاں سے دیں گے؟" دانی نے پوچھا۔

"اب تم کو سیٹھ تیس روپے دیتا ہے۔ مجھ کو پچیس روپے دیتا ہے۔ اگر ہم ہر مہینہ پچاس روپے نورا مینشن کے مالک کو دیں تو چودہ مہینے میں ایک کمرہ کا فلیٹ ہم کو مل سکتا ہے"

بہت دیر تک دانی سوچتا رہا۔ سریا کا ہاتھ دانی کے ہاتھ میں تھا۔ یکا یک دانی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ہاتھ میں ایک ننھے بچے کا ہاتھ بھی آگیا ہے۔ اس کا دل عجیب طریقے سے پگھلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے اور اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں سریا کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیں۔ اور روندھے ہوئے گلے سے بولا۔

"ہاں میرے بچے کا گھر ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ میں سوچتا ہوں سریا۔ میں تین گھنٹے کیلئے ڈونگی کے چائے خانے میں رات کے گیارہ بجے سے دو بجے تک کام کروں۔ جب تو اپنا ریستوران بھی بند ہو جاتا ہے، گیارہ بجے۔ پھر گیارہ بجے سے دو بجے تک خانے میں کام کرنے میں کیا حرج۔ وہ خانے کا سیٹھ دس روپے پگار دینے کو بولتا تھا مگر میرے خیال میں وہ پندرہ

روپے تک دے دیگا"

"جب تو ہم جلد ہی گھر لے سکیں گے" ثریا نے خوش ہو کر کہا۔

"اور اگر ایرانی اُدھار روپے دے تو شاید اپنے گھر پر ہی بچہ پیدا ہوگا" دانی کا چہرہ خوشی آنند امید کی روشنی سے چمکنے لگا۔ یکایک اس نے ثریا کا ہاتھ زور سے دبا کر کہا ——"آؤ دعا کریں"

وہ دونوں اٹھ کر گرجا کے آہنی جنگلے کو پکڑ کر دوزانو ہو گئے۔ جالی دار آہنی سلاخوں کے درمیان گرجا کے وسیع صحن کے وسط میں یسوع مسیح کا بت صلیب پر آویزاں تھا اور ایک طرف نیلے پتھر کے گراٹو میں مریم نے مقدس بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا اور گراٹو میں مومی شمعیں روشن تھیں اور گل مہر کی نازک پتیاں ہوا کے جھونکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چاروں طرف گر رہی تھیں اور مقدس مریم کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا، جیسا بچہ ہر ماں کے تصور میں ہوتا ہے اور یہ رات مریم کے لبادے کی طرح مہربان تھی اور کسی نیند میں ڈوبے ہوئے یسوع کے خواب کی طرح معصوم......

دعا پڑھ کر دانی نے ثریا سے پوچھا۔

"یہ پادری آج بار بار اپنے وعظ میں آزادی۔ روٹی اور کلچر کی بات کر رہا تھا —— آزادی اور روٹی تو خیر سمجھ میں آتی ہیں مگر یہ کلچر کیا ہے"؟

"میرے خیال میں کوئی میٹھا کیک ہوگا" ثریا سوچ سوچ کر بولی۔

"اور وہ دنیا میں امن کی بات بھی کرتا تھا ——!" دانی بولا ——"مگر ہمیشہ تو میرے پیٹ میں ایسی جنگ ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ پیٹ کی جنگ کیسے بند ہوگی۔ او خدا! کیسی بھیانک جنگ ہوتی ہے میرے پیٹ میں......"

"میں جانتی ہوں۔ میری ماں بھی جانتی تھی۔ میری ماں بہنیں بھی۔ میرے بھائی بھی اور ہم سب کا باپ بھی" ثریا تاسف انگیز لہجے میں بولی —— "اور میرے باپ کا

ماں بھی ..... بے چارہ بڈھا ..... کوئی رشتہ ہم سے اس قدر قریب نہیں رہا جس قدر بھوک کا:

"خدا کرے ہمارا بیٹا بھوکا نہ رہے!"

پیٹ میں امن، اور دنیا میں امن، جیسا کہ وہ پادری کہتا تھا — آمین!

ایک دن سریا جس غیر متوقع طریقے سے آئی تھی اُسی طرح وہاں سے چلی گئی۔ خبر سنتے ہی دانی بھاگا بھاگا رات کے ڈیڑھ بجے ڈورا گلی کے چائے خانے سے اپنے فٹپاتھ پر آیا تو اُس نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک اژدہام اور پولیس کے بہت سے سپاہی سڑک پر اور فٹ پاتھ کے آس پاس کھڑے ہیں اور ایک ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھا ہوا ہے اور اُس کا انجن گرجا کے آہنی جنگلے کو موڑتا ہوا گل مہر کے پیڑ سے ٹکرا گیا ہے۔ پچھلے پہیوں پر سریا اور علی اکبر کی لاشیں رکھی ہیں۔ کیونکہ یہی دو لوگ فٹ پاتھ پر سوتے ہوئے ٹرک کی زد میں آ گئے تھے۔ اگر دانی بھی سویا ہوتا تو اس وقت اس کی لاش بھی یہیں پڑی ہوتی۔ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں تیزی سے گذرتے ہوئے یا ایک دوسرے سے ریس کرتے ہوئے ٹرک فٹپاتھ پر چڑھ جاتے ہیں۔ بڑے شہروں میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔

دانی ایک احمق کی طرح خون میں لت پت سریا کی لاش پر جھکا رہا۔ پھر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھنے لگا اور کانپتے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا۔

مگر ابھی تو وہ زندہ تھی۔

دو گھنٹے پہلے اُس نے اور میں نے اپنی جگہ پر کھانا کھایا تھا۔

وہ بالکل زندہ اور تندرست تھی۔

اُس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

اُس کے پیٹ میں میرا بچہ تھا۔
چھ مہینے کا بچہ۔
میرا بچہ ......

"کس نے مارا اُنھیں ؟" یکایک دانی دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کستے ہوئے زور سے چیخا۔

ایک تماشائی نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ فوراً پولیس کے دو سنتریوں نے دانی کو پکڑا۔ مگر دانی نے گھونسے مار کر دونوں سنتریوں سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اسی عرصہ میں دونوں سنتری اُس سے کشمکش کرتے ہوئے اُسے ٹرک سے دور گھسیٹ کر لے گئے تھے دانی اُن سے آزاد ہو کر ٹرک کی جانب لپکا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ بدن جھک گیا۔ اور پھر ایک مینڈھے کی طرح تن گیا۔ اُس کے ہونٹوں سے جانور نما ایک بھنچی ہوئی سی غراہٹ نکلی۔ وہ اپنے سر کو ایک خوفناک طریقے سے آگے بڑھائے اور جھکائے تیزی سے ٹرک پر حملہ آور ہو گیا......

پورے چھ ماہ وہ اسپتال میں رہا۔ کیونکہ اُس کا سر کھل گیا تھا۔ وہ بچ تو گیا تھا مگر اس کے دماغ کا ایک حصّہ تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا اور اب اُس کا سر پنڈولم کی طرح ہوتے ہوئے آپ ہی آپ ہلتا تھا اور اس کا وحشی مینڈھے کی طرح پلا ہوا مضبوط جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح دُبلا ہو گیا تھا اور اسے سب کچھ یاد تھا اور بہت کچھ یاد بھی نہیں تھا۔ اور اب وہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگر گاہک اُس سے چائے مانگتا تو وہ اُس کے سامنے پانی لا کر رکھ دیتا۔ اور اگر کوئی آملیٹ مانگتا تو وہ اس کے سامنے ماچس کی ڈبیا رکھ دیتا۔ اس لئے ایرانی ریستوران کے مالک نے مجبور ہو کر اُسے ملازمت سے الگ کر دیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک فٹ پاتھ پر اسی جگہ سوتا تھا جہاں شریا سوتی تھی اور اُس نے اپنے بچے کے کپڑے گرجا کے آہنی جنگلے کے کونے میں چھپا کر رکھ دیئے تھے اور رات کے

سناٹے میں وہ اکثر انہیں نکال کر بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر تکا کرتا تھا اور فٹ پاتھ پر حجامت کرنے والا داتو نائی اکثر اس سے پوچھتا۔

"یہ کس کے کپڑے ہیں؟"

"میرے بچے کے ہیں۔"

"تیرا بچہ کہاں ہے؟" تھاگولین کے چائے خانے کا قاسم اس سے پوچھتا۔

"وہ میری ثریا کے پاس ہے۔"

"تیری ثریا کہاں ہے؟"

"وہ میکے گئی ہے۔"

"وہاں سے کب لوٹے گی؟" گوپی جیب کترا اس سے پوچھتا۔

"جب میرا گھر بن جائے گا۔" دانی انتہائی معصومیت سے جواب دیتا۔

اس کے بعد کئی ماہ تک سدانی وہ گھر بناتا رہا۔ اینٹیں تو اس کے پاس تین تھیں۔ مگر گھر کا نقشہ ہر روز بدلتا تھا۔ وہ اب پچاس منزل کا ایک محل تھا جس میں صرف فٹ پاتھ پر رہنے والے داخل ہو سکتے تھے۔ اس محل میں زندگی کی ہر سہولت اور آسائش مہیا تھی۔ بجلی کی لفٹ اور ٹیلیفون۔ ایک چھوٹا سا سینما اور نرسری اسکول اور چھت پر خوبصورت تتلیوں والا گارڈن دیوار گیر روشنیاں، اور مدھم مدھم رنگوں والے غالیچے اور خوبصورت تتلیوں کی طرح آراستہ حرام عورتیں اور بیچے، اور دھیمے دھیمے بجتے ہوئے ارغنون اور مہذب مرد مسکراتے ہوئے سگریٹ پیتے ہوئے، ایک دوسرے سے جام ٹکراتے ہوئے اور ان کے کپڑے بھی عمدہ اور خوشبودار اور جیبیں سکوں سے بھری ہوئی، اور سب کچھ جو غریب لوگ سینما میں دیکھتے ہیں اور امیر اپنے گھر پر رکھتے ہیں وہ سب کچھ اس گھر میں موجود تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند، درخشاں، خوبصورت، عالیشان۔ وہ گھر اتنا ہی خوبصورت تھا جتنا کسی کے گھر کا تخیل ہو سکتا ہے

اور پھر جب کئی ماہ کی کاوش کے بعد وہ گھر مکمل ہو گیا تو رات کے گیارہ بجے سے ایک بجے تک ڈانی ٹین کا ایک ڈبہ پیٹتے ہوئے چارک روڈ کے دونوں فٹ پاتھ اور ٹھوگالین کے فٹ پاتھ اور ڈوراگلی بلکہ گراس بازار اور چارک پارک کے فٹ پاتھیوں کو اُس نے گھر میں آنے کی دعوت دیتا پھرا۔ ظاہر ہے اُس کے پاس وہی تین اینٹیں تھیں۔ مگر اب اُس نے اُن تین اینٹوں کو چارک چوک کے ٹریفک آئی لینڈ کے اندر رکھ دیا تھا اور اس طرح اپنا محل تعمیر کر لیا تھا اور اب وہ سارے فٹ پاتھیوں کو اپنے بیوی بچوں سمیت گھر میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

ڈوراگلی کے پاٹل نے روک کر کہا "لیکن میرے تو سات بچے ہیں اور ہم سب کے سب اسی کھلے فٹ پاتھ پر بڑے آرام سے سوتے ہیں۔ تمہارے تین کمروں والے فلیٹ سے ہمارا کیا ہوگا؟"

"میں تمہیں سات کمروں والا فلیٹ دوں گا۔" ڈانی نے ٹین پیٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

"کب آئیں ہم لوگ؟" پاٹل کی بیوی نے اپنی مسکراہٹ کو ساڑھی کے پلو میں چھپا کر اُس سے پوچھا۔ اُس کی ہنسی رکی نہیں پڑتی تھی۔

"کل صبح جب ثریا بچے کو لیکر میکے سے آجائے گی۔ میں اپنے گھر کے دروازے سب کے لئے کھول دوں گا۔ دروازے پر بینڈ ہوگا۔ رنگا رنگ جھنڈیاں ہونگی اور بندھن واریں اور میں پادری کو گھر کے مہورت کے لئے بلاؤں گا اور وہ بائبل سنائیگا اور گرجا کے گھنٹے بجیں گے اور اُس وقت تم سب لوگ میرے گھر میں داخل ہو گے۔"

ڈانی کی کانپتی ہوئی آواز میں انتہائی خلوص تھا۔ اُس کا دُبلا چہرہ زرد زرد اور بخار زدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور بے چین تھیں اور [illegible] سے اُس کے ہونٹوں پر کف آ چلا تھا اور اُس کے رُوکھے سوکھے بالوں [illegible] پاتھ کی خاک چمک رہی تھی۔

دوسرے ان ذاتی بُلوگرتو کے باہر مقدس مریم کے قدموں میں مُردہ پایا گیا
اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور نیلے آسمان میں کسی نامکمل سپنے کو تک رہی تھیں۔ اس کے
کپڑے پھٹے چیتھڑے اور تار تار تھے۔ اور اس کے سینے پر وہی تین اینٹیں رکھی تھیں۔ اور
اُس نے مقدس مریم کے قدموں کے فرش پر اپنا سر مار کر توڑ دیا تھا۔

......

......

گرجا کھول دو۔
اور گھنٹے بجاؤ۔
دیکھو یسوع مسیح جا رہا ہے۔
اپنے سینے پر اینٹوں کی صلیب لئے ہوئے۔
اب جنت کے دروازے غریبوں کے لئے کھل گئے ہیں۔
کیونکہ ایک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہیں گذر سکتا۔ لیکن ایک امیر قانون کے
ہر ناکے سے گذر سکتا ہے۔
اور اب اس دھرتی کے مالک غریب ہوں گے۔
اور غریبوں کے مالک امیر ہوں گے۔
دیکھو وہ یسوع مسیح جا رہا ہے۔
آؤ اُسے سنگسار کریں۔

بچوں کا ادب

جن پر حکومت ہند نے مصنفین
کو انعامات دئے۔

نجومی آپا اطہر پرویز ۱٫۷۵
مصنوعی چاند " ۱٫۵۰
خلا کا سفر " ۱٫۲۵
توانائی کا راز " ۱٫۲۵
ستاروں کی دنیا " ۲٫۰۰
بھارت دیس ہمارا دیس
جاوید اقبال ۱٫۰۰
ہماری آباد دنیا
فصاحت حسین ۱٫۰۰

بدن کی کہانی (معلومات)
اطہر پرویز ۱٫۲۵
تیس مار خاں (بچوں کا ناول)
شاہد علی خاں ۰٫۷۵
اکبر و بیربل کے لطیفے ۰٫۴۰

پتھروں کا مُغنّی

وحید اختر

قیمت: چھ روپے

(مجموعۂ کلام)

"وحید اختر کے کلام میں گہرائی، بلاغت اور معنویت ہے، فن کے نئے امکانات پر ان کی نظر ہے مگر انھوں نے عالمی کلاسیکی ادب سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ انھیں خوبیوں سے یہ مجموعہ ہماری شاعری میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ (پروفیسر آل احمد سرور)

"وحید اختر اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو شاعری کی موروثی آبرو کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے نئی زندگی کی تخلیقی عکاسی کرتے ہیں۔ میں نے ان کے مجموعے کو پہلے سے آخری صفحہ تک تامل کے ساتھ پڑھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وحید اختر "پتھروں کا مغنی" سے لیکر "صحرائے سکوت تک" یکساں طور پر کامیاب ہیں۔
(پروفیسر مجنوں گورکھپوری)

چند ادبی کتابیں

ادب اور زندگی (تنقید)
پروفیسر مجنوں گورکھپوری ۵/-
ادب کا مطالعہ (تنقید)
اطہر پرویز ۵/۰
رقصِ بسمل (افسانے)
صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲٫۷۵
دودھ اور خون (افسانے)
صدیقہ بیگم ۲٫۵۰
ہولی اور چراغ (ڈرامے)
اطہر پرویز ۲٫۶۲

شرابی (ڈرامے)
اطہر پرویز ۰٫۶۵
ہماری سائنس
وزارت حسین ۲٫۰۰

ہماری مطبوعات

سائنس کے کرشمے وزارت حسین ۲٫۰۰ سائنس کی دنیا وزارت حسین ۲٫۶۴

اُردو گھر ○ یونیورسٹی مارکیٹ ○ علی گڑھ

سرِ وادیِ سینا

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا!
اب وقت ہے دیدار کا، دم ہے کہ نہیں ہے
اے جذبۂ دل، دل کا بھرم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے؟

(۲)

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
اے دیدۂ بینا!
پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو، نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

(۳)

سنو کہ شاید یہ نورِ صیقل ہے اس صحیفے کا حرفِ اول
جو ہر کس و ناکسِ زمیں پر، دلِ گدایانِ اجمعیں پر
اُتر رہا ہے فلک سے اب کے
سنو کہ اس حرفِ لم یزل کے
ہمیں تمہیں بندگانِ بے کس، علیم بھی ہیں، خبیر بھی ہیں
سنو کہ ہم بے زبان و بے بس
بشیر بھی ہیں، نذیر بھی ہیں
ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہو گی
یہیں عذاب و ثواب ہو گا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہو گا

پاکستان

فیض احمد فیض

جاگو میرے لال

جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھورا اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکیں ہیں
بالی دلھنیا، بانکے بیرن
دیکھو سونا راج پڑا ہے
تم بن کتنا کاج پڑا ہے
بیری براجے راج سنگھاسن
تم ماٹی میں لال
اُٹھو، اب ماٹی سے اٹھو،
جاگو، میرے لال،
اب جاگو میرے لال،
تمری سیج سجاؤن کارن
دیکھو آئی رات اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں ان دکھین انکھین نے
ڈھیر کئے ہیں اتنے موتی
اتنے موتی
جن کی جیوتی سنگ تمہارا
پگ پگ لاگا نام چمکنے
جاگو میرے لال،
ہٹ نہ کرو، ماٹی سے اٹھو
جاگو میرے لال،
اب جاگو میرے لال

پاکستان — احمد ریاض

الحاق

(ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے نام)

ساتھیو، ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر
کون افکار کی قندیل بجھا سکتا ہے
کون کر سکتا ہے احساس کی شدت کو اسیر

شہر بانٹے گئے، تقسیم ہوئی ہیں گلیاں
قیس و لیلیٰ کی محبت کا فسوں ختم ہوا
کتنے چہرے ہیں جنھیں دیکھ نہ پاؤں گا کبھی
کتنی آنکھوں کی لطافت کا فسوں ختم ہوا

صبح آزادی تو پھوٹ چکی ہے لیکن
حال و ماضی کے گھروندوں میں اندھیرا ہی رہا
برق خرمن کہیں، کانٹے کہیں، دستِ گلچیں
فکرِ جاناں، غمِ انسان، غمِ دنیا ہے وہی

اب بھی بدلے نہیں آدابِ جہاں داری کے
اب بھی انساں کی پرواز میں حائل ہے غبار
اب بھی سرکش ہیں حوادث کی ہوا کے جھونکے
اب بھی موجوں کے تلاطم میں پھنسے ہیں منجدھار

آج بھی زیست کے نرداہے پہ بیٹھے ہیں اداس
مشترک درد کے مارے ہوئے گھبرائے ہوئے
ہم نہ کافر ہیں، نہ مومن ہیں، نہ افلاک نشیں
قحط و افلاس کے روندے ہوئے ٹھکرائے ہوئے

ساتھیو آؤ ادھورے ہیں ابھی یہ سپنے
ساتھیو آؤ ابھی کام بہت باقی ہے
اپنے بیدار تقاضوں کا پھر اعلان کریں
زندگی اب بھی ہمیں صرف ہمیں تکتی ہے

ساتھیو، ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے احساس کی شدت کو اسیر
شہر بٹ سکتے ہیں، ہو سکتی ہیں گلیاں تقسیم
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر

ترکی — ناظم حکمت

سوال

زمین کی یہ تمام دولت
نہ کر سکے گی کبھی پوری
ہوس کو سرمایہ داریوں کی
کہ ان کا مقصد ہے زندگی میں
فقط زر و مال اور پیسہ
تم ان کی خاطر سے خواہ کتنا کما کے دے دو
تم ان کی خاطر سے ختم ہو جاؤ
یا کہ اوروں کو ختم کر دو
ہوس کی ان کی مگر کوئی انتہا نہیں ہے

صداقتوں کو بھلا وہ تسلیم کب کریں گے
اگاتے جائیں گے سوکھی شاخوں میں
[illegible]
سجائے ہوئے یہ جھوٹ اور ایسے دھوکے
ہر اک گلی اور سڑک پہ پھیلے ہوئے ملیں گے

تمام خیموں، تمام ڈیروں کے نیچے دریائی عورتیں کچھ
کٹے ہوئے سر کا کوئی انساں
لباس چیتے کا کوئی پہنے
کشیدہ تاروں پہ چلنے والی،
گلابی نیکر میں بیں جواں جسم، نیلی آنکھیں
یہ سب کے چہرے، وجود سب کے
بناوٹی ہیں

سوال دراصل پوچھنا ہے
کہ ایسے دھوکے میں آؤ گے یا الگ رہو گے،
اگر نہ کھایا فریب تم نے تو جی سکو گے
اگر کہیں کھا گئے یہ دھوکا تو خاتمہ ہے!

جاپان — ہاجیمے کجیما

موڑ

سترہ سال کا
میں
بھوک سے بے حال نڈھال
میں
ڈھونڈتا ہوں کہ ملے کھانے کو کچھ
میں
گھومتا پھرتا ہوں ممنوع علاقوں میں کہ
میں
چھپتا پھرتا ہوں پولیس والوں سے
میں
دیکھ لیتا ہوں کہیں چند سڑے سے آلو
میں
منہ میں بھرتا ہوں انھیں اور نگل جاتا ہوں

میں
قے پہ قے کرتا ہوں
میں
سوکھتا جاتا ہوں
میں
روز بروز
میں
ایک کتا کہ نہیں جس کا کوئی پرساں حال
میں
کوڑا کرکٹ بھی اندھیرے میں چبا جاتا ہوں
میں
دوراز کار امیدوں پہ جئے جاتا ہوں
میں

اپنے جذبات کی بے نام تڑپ سے مجبور
میں
ایک خلا ہے کہ جہاں زیست کئے جاتا ہوں
میں
فلم کے پوسٹروں پر کی حسیناؤں سے بہتر ہوں
میں
اکیلا ہوں کہ کوئی یار نہ دوست
میں
صفر ہوں کہ
میں اَن گنت مفلس و ناداروں میں بس ایک ہی ہوں

میں
تو بس ایک جواں سال ہوں بازاروں میں
میں
اجنبی چہروں کے انبوہ میں ہوں خو سفر
میں
بھی حق رکھتا ہوں چاول کے لئے مانگ کروں
میں
بننے ہی والا ہوں شہری وہ کہ جس کا منصب ر
انقلاب آفریں جذبات کی بے ساختگی

جنوبی ویتنام

گیانگ نام

اجمل اجملی

فتح

[یہ نظم اس بہادر ویتنامی دوشیزہ کے بارے میں لکھی گئی ہے جس کا نام دتھی تھانگ تھا۔ ویتنامی زبان میں یہ لفظ فتح کا ہم معنی ہے جب انقلابی سرگرمیوں کے لئے اسے ۲۰ سال قید با مشقت کا حکم سنایا گیا تو اس نے ایک معصوم تبسم کے ساتھ اس سزا کا خیر مقدم کیا]

سزا یہ بیس برس قید با مشقت کی
ترے وجود کی عظمت ہلا نہیں پائی
ترے لبوں پہ فروزاں دیئے تبسم کے
سزا کی تند ہوا بھی بجھا نہیں پائی

ہے حضورِ عدالت یہ بانکپن تیرا
عروسِ ارضِ وطن کی طرح جمیل و حسیں
خود اپنے نام کی مانند سرفراز و بلند
خود اپنے نام سے وابستہ ولولوں کی امیں

عجیب لمحہ پر درد تھا زیست کا وہ دن
کہ جب بڑھے تھے قدم عزم و جہد کی جانب
رہِ جہاد میں انسوں کی برچھیاں لے کر
ہوئے تھے ہم بھی عروسِ حیات کے طالب
امیدِ فتح میں یہ نام تو نے پایا تھا
زباں پہ باپ کی بے ساختہ جو آیا تھا

سزا یہ بیس برس قید با مشقت کی
ترے وجود کی عظمت ہلا نہیں پائی
ترے لبوں پہ فروزاں دیئے تبسم کے
سزا کی تند ہوا بھی بجھا نہیں پائی

سیاہ زلف کا بادل جھکا ہے شانوں پر
چمکتی آنکھوں میں پرچھائیاں بسیرے کئے
یہ زلف نازکہ ماں کے عظیم ہاتھوں نے
اسے سنوارا تھا پھول کھینچنے کے لئے

یہ زلف جس پہ سرِ راہ پھول اہلے کے
نثار ہونے کی حسرت میں والہانہ گئے
تجوں کے عیش میں ڈوبے درندہ خو چہرے
ترے وجود کی عظمت ہلا نہیں پائے
ستائے جس مسلسل کے سر پہ رقص کناں
چراغِ عزمِ بغاوت بجھا نہیں پائے

مری زمین کی مٹی، عظیم دو تھی تھی ننگ،
تو ہی تو تھی کہ لڑکپن کے دور میں جس نے
عظیم تر کی سُنی تھیں کہانیاں، پر دن
وطن پہ یورشِ دشمن کے دور میں جس نے

یہ روشنائی میں آلودہ انگلیاں تیری
وطن کے حکم پہ بندوق کے لئے تیار
ملی تھی بھائی ترے ذوق سے پختگی دل کی
اٹھے تھے پہلے پہل جب قدم پئے یلغار
بڑھی تھی پیار سے تو گھاتیوں کا ٹے
ہوئی تھی اپنی مجاہد بہن پہ بڑھ کے نثار

زبانِ شہر پہ ہے تیرا تذکرہ ہر دم
کہ تو نے جہد میں "دوبارہ فتح پائی ہے"
زمیں کی طرح وسیع یہ محاذِ جنگ جہاں
مجاہدوں کی کئی نسل کام آئی ہے
ترے لبوں پہ تبسم ہے یا کنول کا پھول
کہ فصلِ گل میں سرِ جوئبار کھلتا ہے
رواں ہے شہر کو ہے ساتھ اسلحوں کی کھیپ
ثبوتِ عزمِ جواں اس سفر سے ملتا ہے

سفر سے لوٹی تو جانبازوں کی خبر لائی
جبھی تو شہر میں ہر شخص تجھ پہ شیدا ہے
ترے لباس کی سج دھج بھی ہے عزیز انہیں
زبانِ شوق پہ ان گیسوؤں کا چرچا ہے
وہ گھنگ جو بیٹھے تھے منصف بنے سزا دینے
تری ادائے بغاوت سے تھرتھرا اٹھے
نہ بس میں قتلِ تبسم، نہ بس میں قیدِ ادا
یہ بےبسی بھی عجب تھی کہ تلملا اٹھے

وہ سڑکیں آج جو چھلنی ہیں بم کے غاروں سے
تو آئے گی تو وہ سرسبز ہوں گی تیرے لئے
ترا تو نام ہی ہے فتح اور آج وہ نام
نقیبِ روز منورہ ہے زمانے نے
وہ نام آج لڑائی کی خندقوں میں تمام
ہے ایک شعلۂ جوالۂ عزمِ خوش انجام

جنوبی ویتنام

گیانگ نام

اشرف عابدی

میرا وطن

میرا بچپن
وہ حسیں خوابگہِ ذوقِ جمال
وہ مری ننھی کتابوں کی کہانی کا فسوں
جن سے جاگا تھا کبھی
جذبۂ ایمانِ وطن

میرے خوابوں میں
چہچہاتے ہوئے مرغانِ خوش الحانِ چمن
جو مرے جوشِ وطن دوستی سے
ایک تشبیہہ
رشکِ ناہید سے کچھ اور سوا چاہتے تھے
میرے دمساز
مرے ساتھ رہا کرتے تھے

اور نزدیک کے تالاب کے گرد
اپنی خوابوں کی پری
کسی تتلی کو پکڑنے کے لئے
دوڑتا رہتا تھا
جو صبح شام وسحر
اور جو فرصت پاتا
کھیلتے میں جو کبھی ماں آکر
پیار سے
ڈانٹ دیا کرتی تھی
میری ساتھی مری ننھی گڑیا !
تم بسورا ہوا منہ دیکھ کے اکثر میرا
کیسا ہنستی تھیں
کہ کیا احمق ہے

کیا ہوا جانے یکایک کہ فضا میں ہر سو
رقص فرما ہوئی بارود کی بو
پھر ہوا اِم کو جن باس کا حکم
رام نگری کوئی سونی ہوئی پھر
پھر ہوس جاگی کسی دیو کی
سیتا کا ہرن پھر سے ہوا
یہ یقین کون کرے
مری ساتھی مری ننھی گڑیا
جنگ کی آگ میں
کود پڑی مرے ہمراہ
لڑنے سچائی کی جنگ،

وہ ملاقات بھی کیا خوب ملاقات تھی جب
جنگ پہ جاتے ہوئے
تم اسی طرح سے ہنس دی تھیں
مگر کچھ نہ کہا ؟؟؟

روح میں میری
اک احساس نے کروٹ لی تھی

کہ یہ بادام سی
کالی آنکھیں
کتنی پیاری ہیں
کتنی سجتی ہیں
وقت کے دھارے میں
میں بہہ گیا
کچھ کہہ نہ سکا ... ؟؟؟
چند دن کے لئے۔
جب ہلاکت کا دیوتا سویا
رک گئی جنگ !!!

انھیں محبوب صبا زاروں میں
تم ملیں
خوابوں نے کروٹ بدلی
رنگ کی دھار چلی
نور کی چھوٹ پڑی
نغمے گونجے ——
کہیں سائے میں وہیں پیڑوں کے
سرگوشیاں سر جوڑ کے بُننے لگیں جال

میں نے تب جانا
ترے جسم کی گرمی کیا ہے !!

کیا بھیانک یہ تصور ہے کہ تو
جنگ کی نذر ہوئی
دردے دل کا عجب عالم ہے
تتلیاں
مرغ خوش الحان
حسیں پھول

وہ نیلی جھیلیں
ٹھنڈے شانے
مرکز جذبۂ ایمان وطن تھے کسی روز

آج بھی مجھ کو بہت پیاری ہے
یہ زمیں
جس کے ہر اک ذرّے میں
بس گئی ہے
.. ترے پاکیزہ لہو کی خوشبو

چین

ہان پی ینگ
انجم اجملی

رات کے ڈھول

(شمالی گنی کے کانکان علاقے میں رات کو بجنے والے ڈھول کی آواز سن کر)

یہ لمحہ لمحہ اُترتی ہوئی سواری شب
یہ افریقہ کا اندھیرا گھنا گھنا جنگل
یہ سرخ پھولوں پہ بڑھتا اداسیوں کا فسوں
یہ سبز پتوں پہ تاریکیوں کا سایہ سا
کچھ اس طرح سے چھپی آدمی کی پرچھائیں
کہ آئینے پہ بھی اک بے حسی سی چھائی ہے
زمیں سے عرش تلک رات کی خدائی ہے

یہ لمحہ لمحہ اترتی ہوئی سواری شب
یہ افریقہ، یہ کہن سال وسط افریقہ
نہ جانے کون سی خلوت میں جا چھپا ہے دن
نہ جانے کون سی منزل میں کھو گئیں لہریں
نہ اب وہ شور سواحل، نہ محشر امواج
بس ایک سانس کی آہٹ سنائی دیتی ہے
کہ جیسے گفتگوئے زیر لب بوقت وصال

یہ لمحہ لمحہ اترتی ہوئی سواری شب
یہ افریقہ، یہ کہن سال وسط افریقہ
ہیں ایک چھوٹے سے میدان سے گزرتا ہوں
فضا میں تاروں بھرا آسماں ہے سایہ فگن
زمیں سے تھوڑی بلندی پہ رقص میں جگنو
فلک سے تا بہ زمیں اک سکوت کا عالم
اچانک آئی گھنے جنگلوں کو طے کرتی
خموشیوں کو جھنکتی سی ڈھول کی آواز
وہ بھی تھاپ میں انداز خود کلامی کا
ہو جیسے کرب و غم میں گھٹی گھٹی آواز

پھر اور تیز ہوئی گونج اب یہ عالم تھا
کہ جیسے نعرے لگاتا ہوا جلوس چلے
کمانیں کڑکیں فضا میں ہزاروں تیر چلیں
وہ گونج جیسے کئی کرتے ایک ساتھ چلیں

صدائیں جیسے گزرتا ہو سر سے اک طوفاں
فراز کوہ سے امڈا ہو کوئی سیلِ رواں
یہ زیر و بم ہے کہ محوِ سفر ہیں شیر و پلنگ
سیاہیٔ شبِ یلدا کا چھٹ رہا ہے جگر
یہ ڈھول بجتے ہیں یا پاس آرہی ہے سحر

صداؤں کی جو دھمک گونجتی ہے جنگل میں
لرز کے پتیاں گرتی ہیں جل اٹھے ہیں الاؤ
ہزاروں نرگسیں جاگی ہیں آنکھ ملتی ہوئی
سکوت خواب سے بیدار ہو گیا جنگل
دھمک سے دھرتی پہ اک کپکپی سی طاری ہے
ہر آن سانس کی رفتار بڑھتی جاتی ہے

یہ ڈھول معجزے افریقہ کی روایت کے
گراں بہا سہی یہ تخلیق ذہن انساں کی
صدائیں جن کی ہمیشہ رواں دواں جذبات
پیام امن و مسرت نقیبِ ذات و صفات

کبھی یہ بجتے ہیں مہماں کے خیر مقدم کو
کبھی چھلکتے ہیں ان میں خوشی کے پیمانے
کبھی صداؤں میں ان کی محبتوں کے پیام
کبھی [illegible] نے

یہ ڈھول معجزے افریقہ کی روایت کے
شکاریوں کی نگاہوں میں بجلیاں بھر دیں
کوئی عدوئے درندہ صفت کرے حملہ
تو ساری قوم کو خطرے سے باخبر کر دیں

صدائیں دوڑ کے جاتی ہیں جنگلوں سے پرے
چھلانگتی ہوئی دلدل، پھلانگتی ہوئی غار
رواں دواں کہ ہو جس طرح پیک خوش رفتار
”اٹھو! کمانیں اٹھاؤ، چلو سوئے پیکار
وہ وقت ہے کہ برہنہ ہو قوم کی تلوار“

طلسم رات کا کچھ اور بڑھتا جاتا ہے
فضا میں چاند کا ٹکڑا، زوال آمادہ
بھٹک کے آگیا ”کاپوک“ کے درختوں پر
وہ لو! کہ ڈھول کی آواز اور تیز ہوئی
دل و دماغ کا میرے عجیب عالم ہے

میں جس جگہ پہ کھڑا ہوں وہ ایک میداں ہے
ہوئی تھی جنگ کوئی اس کے چپے چپے پہ
قدم قدم پہ عیاں ہیں نشانیاں جس کی
کہیں پہ تیر گڑے ہیں، شکستہ فرسودہ

کہیں پہ زنگ لگے خنجروں کی لاشیں ہیں
بزرگ توڑ دلیروں، بہادروں کو لئے
قدم جما کے یہاں حملہ آوروں سے لڑے
بکھر کے رہ گئیں ہر سخت دھجیاں جن کی

یہ ڈھول معجزے افریقہ کی روایت ہے
رہے جو آج تلک گرم مدحتِ اجداد
جو کام آتے رہے تیز اسلحوں کی طرح
کیا ہے جب بھی غلاموں نے بندگی سے جہاد

یہ داستان ہے ماضی کی ولولہ پرور
مگر فسانۂ عہدِ رواں بھی کم تو نہیں
طلوعِ صبح ہے افریقہ کے اندھیروں میں
چمک ہے وادیٔ میکو کے سبزہ زاروں پر
رچی بسی ہے فضاؤں میں آم کی خوشبو
اچھل رہے ہیں سرِ آب مچھلیوں کے پرے

ہے ان کی تھاپ ہے اعلانِ صبحِ آزادی
دھمک سے ٹوٹتی جاتی ہیں سخت زنجیریں
صدا میں ان کی غم و غصہ بھی ہے جوش بھی ہے
زمیں سے تا بہ فلک نغمۂ خروش بھی ہے

سوویت روس

زلفیہ اسرائیلوف
ڈاکٹر محمد عقیل رضوی

بہار آئی ہے تم کو ڈھونڈتی ہے

نذرِ حامد علیم جان

ہمیں دل شاد و غم آزاد کرنے
سحاب آئے درختِ بادام دھونے
پھٹی تھی پو کہ آ پہنچیں بہاریں
ہجومِ طائراں لے کر جلو میں

تری ہی یاد میں آوارہ ہو کر
پھری باغوں میں ویران و شہر
گھنے جنگل میں دریا کے کنارے
کھڑی صحراؤں میں تجھ کو پکارے

عجب تھی رات کی وہ دھند پیاری
بسی مٹی میں خوشبو سوندھی سوندھی
چٹکنے پر تھے خوبانی کے غنچے
کلی کے لب پہ تھے گلریز نغمے

نشاں تیرا نہ کچھ آیا نظر جب
پریشاں اور ہراساں ہو کے وہ تب
اٹھی غصے میں عالم ڈر کے کانپے
تو نعروں سے فضا و کوہ لرزے

چلی اس شان سے بادِ بہاری
ہٹی سرما کی افسردہ سواری
لبوں پہ نغمۂ دلکش کی تانیں
تری ہی کھوج میں نگراں تھیں آنکھیں

تو پھر آخر کو میدانوں میں آئی
شبالوں تک تری تشویش لائی
سوالی تھی ہے کس جا میرا شاعر
بتاتا کون سب لب بستہ [illegible]

تو پھر مثلِ شعاعِ نور اٹھی
سیہ خانے میں میرے آکے ڈوبی
مرے اشکوں سے پھر گویا ہوئی یوں،
کہ تم اس طرح سے ریزاں ہوئے کیوں؟

یہ کیا ہے؟ مجھ سے ہر دم پوچھتی تھی
مرے بچوں کو غم سے پوستی تھی
پتہ مطلوب کا پایا نہ اصلا
ملے بچے اگرچہ بے محابا

سمجھ پاتی نہ تھی کس جا پہ ڈھونڈے
دلِ محزوں سے پھر احوال پوچھے
کہاں ہے وہ مرا شاعر بتاؤ!
زیادہ اب نہ اے لوگو ستاؤ!

جو مجھ کو ڈھونڈھتا رہتا تھا ہر جا
جو میرے حسن کا رہتا تھا شیدا
وہ داماں ہوا دشت و صحرا
مرے [illegible] کو [illegible] تھا

خود اپنی جستجو میں پائے جولاں
اڑائے اس کے افکار پریشاں

بھرے موسم میں جب [illegible]
ہوائیں لالہ و گل چومتی ہیں
مرا شاعر کلام نامکمل
گیا کیوں چھوڑ کر حیران و بیکل

کہاں ہے اس کا لافانیٔ تخیل
کہ جس میں بن گئی ہیں لالہ و گل
کہ جس کے شعر نے پائندگی دی
مجھے فطرت کی ہر تابندگی دی

مجھے جس نے پلایا آبِ حیواں
ہوئی کچھ دلکشی جس سے فروزاں
یہ کس کے غم میں افسردہ ہیں سب لوگ
لباسِ غم میں پوشیدہ ہیں سب لوگ

زبانیں گُنگ اور پژمردہ چہرے
ہے کس کے غم میں شب گیسو بکھیرے
کہو کچھ شاعرِ رنگیں بیاں کی
خموشی گفتگو بن جائے یاں کی

یہ سُن کر خامشی کے ساتھ لے کر
اُسے پہنچا میں باغیچے کے اندر
جہاں تھی قبر اک سنسان و ویران
جلی کچھ ٹہنیاں، افتاں و خیزاں
نہ تھا کوئی جو یاں کا حال کھولے
'اداسی رو رہی تھی بال کھولے'

تو ایسا روح فرسا دیکھ منظر
بہار اُوجھل ہوئی آنکھوں سے یکسر
مرا غم بھی وہ اپنے گئی سات
ہوا پھر یوں کہ بس فوراً ہی رات

کھلے بادام کے صد ہا شگوفے
گرے جو قبر پر چاروں طرف سے

تمہارے گیت اور نغمے سہانے
سُنائے بُلبلِ شیوا بیاں نے

تو پھر مہکیں بہاریں رنج کھو کر
ہوئیں واپس تمہاری یاد لے کر

موسیٰ جلیل
احمل اجملی

سوویت روس

... نہ کر یقیں مری محبوب

عزیز جاں! کوئی تجھ تک جو یہ خبر لائے
کہ "میں جہاد میں جھجکا، رکا، زمیں پہ گرا"
نہ کر یقین کہ جو لوگ جانتے ہیں مجھے
کبھی نہ لائیں گے اپنی زباں پہ یہ کلمہ

یہ اپنے خون سے خورشید، رنگ سرخ رو پیہم
جلا رہا ہے، کہاں پھر کبھی بلائے گا
کسے مجال کہ جھجکے، رکے، زمیں پہ گرے
کہ ایک بار گرا جو وہ اٹھ نہ پائے گا

عزیز جاں! کوئی تجھ تک جو یہ خبر لائے
"وطن کو بیچ دیا میں نے مال و زر کے لئے"
نہ کر یقین کہ جو لوگ جانتے ہیں مجھے
کبھی نہ لائیں گے اپنی زباں پہ یہ کلمے

محاذِ جنگ پہ ہر لمحہ بڑھ رہا ہوں میں
وطن کے نام پہ، تیرے لئے جمائے قدم
اگر میں تجھ سے، وطن سے وفا نہ کر پاؤں
تو پھر مرے لئے یکساں ہیں یہ وجود و عدم

عزیز جاں! کوئی تجھ تک جو یہ خبر لائے
کہ "زندگی کی حدوں سے گذر گیا موسیٰ"
نہ کر یقین کہ جو لوگ جانتے ہیں مجھے
کبھی نہ لائیں گے اپنی زباں پہ یہ کلمہ

بدن ہمارے پسِ مرگ خاک بن جائیں
یہ حریت کے ترانے فنا نہیں ہوتے
مجال کس میں ہے بے جان لاش ہم کو کہے
شہیدِ زیست اسیرِ قضا نہیں ہوتے

سیلون

مِگالہ پالن شویہ
انور صدیقی

گاؤں کی حسینہ

لباس گرد کے بارِ گراں سے بوجھل ہے
نہیں ہے آگ میں حرارت جو یہ لباس چھوئے
سکوں کے نام سے ناآشنا سی لگتی ہے
عذابِ درد سے آباد دل کی بستی ہے
دکھوں سے اس کے جہنم کے دکھ پشیماں ہیں

غموں نے شعلگی کا غرور توڑا ہے
طویل فاقوں نے رگ رگ سے خوں نچوڑا ہے
دکھوں کے بوجھ تلے جیسے دبتی جاتی ہو
عجیب سایوں کا مسکن ہیں سوگوار آنکھیں
لباسِ درد میں لپٹا ہوا بدن گویا

یہ گھر کے چاروں طرف منہ بسورتے بچے
وہ آگ دل میں لیے کسمساتے رہتے ہیں

جو ان کے گھر میں ہے روشن جو گھر جلاتی ہے
عقابِ خواب کے سب بال و پر جلاتی ہے
غریب باپ غلامانِ اہلِ زر میں ہے

پھر آج شام ڈھلے، شہر رنگ و بو سے کوئی
سکوتِ شام کی تحریر پڑھنے آئے گا
ٹھہر کے دیکھے گا غمناک جھونپڑوں کی قطار
پھر اپنے کیمرے کی بے زباں نگاہوں میں
سجا کے درد کی تصویر، لے کے جائے گا

کینیا

جوزف ای کاریوکی
شرف عابدی

نئی زندگی

یہ بارش، ہو رہے گی آج کی شب
فضائیں کہہ رہی ہیں
مگر ہم لوگ کب سے منتظر ہیں

جذبۂ شوق یہ کہتا ہے کہ خوابوں کی دلہن
جھم سے آجائے گی
بارش ہی کے ساتھ
آج ہوتی ہے درِ دل پہ یہ دستک کیسی
دل دھڑکتا ہے ہر اک آہٹ پہ
ایک جھونکے ہی میں بجھ جاتا ہے ننھا سا دیا
ایک لمحہ
وہ قیامت کی گرج
بجلیاں تڑپیں چھماکے کے ساتھ
وہ چکاچوند کہ چندھیانے لگیں آنکھیں کبھی
ہل گئے دل
وہ دھماکہ
کہ قیامت کی دلیل
مختصر وقفہ
سکوتِ پیہم
اور پھر ٹوٹ کے برسا پانی

ایسا طوفاں
وہ بارش، کہ لگا
آسماں ٹوٹ پڑے گا شاید
اندر خود دھک گئے
وہ شور قیامت اٹھا
زور گھٹنے لگا بارش کا
برسنے لگی معمول کے ساتھ

فضا میں ہے اب سکون ہر سو
نہیں ہے پہلی سی تیز دھڑکن
یہ دل بھی اب مطمئن ہوا ہے
وہ پل قریب آگیا ہے یارو
کہ سوکھی دھرتی پہ ہل چلیں گے
کہ بوئے جائیں گے سوکھی دھرتی میں بیج پھر سے
گنواریاں گاؤں کی لگائیں گی
اپنے ہاتھوں سے ننھے پودے
یہ زندگی پھر سے کھل اٹھی ہے
یہ زندگی پھر سے کھل اٹھے گی

ویت نام

ڈاکٹر ہوچی منہ

اجمل اجملی

حدیثِ زنداں

[۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۳ء تک جمہوریۂ ویت نام کے مرحوم صدر ہوچی منہ چین کے کوانگ سی صوبے میں چیانگ کائی شیک کے ہاتھوں اسیر رہے۔ یہ نظمیں اسی جیل کی یادگار ہیں]

ملاقات

جیل کے احاطے میں سلسلہ سلاخوں کا
شوہر اور بیوی کے درمیان حائل ہے
اس قدر قریب آکر دوریاں نہ مٹ پائیں
درمیاں مٹیں کیسے اک جہان حائل ہے

فرطِ غم سے لب چپ ہیں بات کر نہیں سکتے
سعی پرسشِ غم میں ہونٹ کپکپاتے ہیں
بے بسی نگاہوں کی، عرضِ حال کرتی ہے
آنکھ کے کٹوروں میں اشک تھرتھراتے ہیں

یہ فضائے غم آگیں دل پہ وار کرتی ہے
اہل دل کے سینوں سے آہ سی ابھرتی ہے

بے خواب راتیں

جیل کی راتوں میں جب نیند نہ آئی مجھ کو
مشعلیں نظموں کی ہر آن جلائیں میں نے
جب کوئی نظم مکمل ہوئی، زنداں سے پرے
نظریں آزاد ستاروں سے ملائیں میں نے

روشنی بھی بکتی ہے

جیل میں جو آئے ہو روشنی کی قیمت دو
کوانگ سی کے زنداں میں یوں دیئے نہیں جلتے
اس دیارِ ظلمت میں روشنی بھی بکتی ہے
روشنی کی قیمت ہیں کوانگ سی کے چھ سکے

گلاب اور قیدی

گلاب کھلتے ہیں گلشن میں خشک ہوتے ہیں
یہ ان کے حال پہ کس کی نگاہ جاتی ہے
مگر گلاب کی خوشبو بدن چرائے ہوئے
سنانے ان کی کہانی قفس میں آتی ہے

ہندوستان — ساحر لدھیانوی

ظلم کی قسمت

(پاترس لومبا کے نام)

ظلم پھر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

خاکِ صحرا پہ جمے، یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ، یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اڑاتی رہیں ظلمت کے نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمتِ ناکارہ و رسوا سے کہو
جبر کی حکمتِ پرکار کی ایما سے کہو
محملِ مجلسِ اقوام کی لیلیٰ سے کہو

خونِ دیوانہ ہے، دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تند ہے، خرمن پہ لپک سکتا ہے

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ، کہیں پتھر بن کر
ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے، آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے، سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے

ظلم پھر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

مخدوم محی الدین

اندھیرا

رات کے ہات میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ

وہ تڑپتے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مخدوم محی الدین

چپ نہ رہو

(لوممبا کے قتل پر)

شب کی تاریکی میں اِک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے، ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح
آدمیت کا ضمیر
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سناٹے میں پھر خون کے دریا چھلکے
صبح دم جب مرے دروازے سے گذری ہے صبا
اپنے چہرے پہ مَلے خونِ سحر گذری ہے
خیر ہو مجلسِ اقوام کی سلطانی کی
خیر ہو حق کی، صداقت کی، جہاں بانی کی
اور اونچی ہوئی صحرا میں اُمیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشمِ سحر سے ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشانِ قاتل کے
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو چپ نہ رہو

مخدوم محی الدین نمبر

مخدوم ایک بلند پایہ شاعر تھے۔
مخدوم ایک بے غرض اور ایماندار سیاست داں تھے۔
مخدوم ایک شفیق اُستاد تھے۔
مخدوم غریبوں کے ہمدرد تھے۔
مخدوم عوام کے محبوب رہنما تھے۔
مخدوم انسانیت کے خادم تھے۔
مخدوم ایک عظیم انسان تھے۔

مخدوم محی الدین نمبر

میں مخدوم کی شخصیت اور شاعری کے ہر پہلو پر پُراز معلومات مضامین ہوں گے۔
ان مضامین بھی جو مخدوم کی زندگی میں شائع ہوئے اور وہ مضامین بھی جو مخدوم کے بعد لکھے گئے۔
مخدوم کی نظموں، غزلوں، مضامین اور خطوط کا انتخاب
مخدوم کی متعدد عکسی تصاویر۔
ضخامت تقریباً ساڑھے تین سو صفحات ——— قیمت صرف ۳ روپئے
شاہکار کے مستقل خریداروں کی خدمت میں یہ نمبر مفت پیش کیا جائے گا۔

منیجر شاہکار ـ ۱۳۴ بخشی بازار الہ آباد ۳

محمد [illegible] اڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے نیشنل آرٹ پرنٹرس میں چھپوا کر دفتر رسالہ شاہکار ۱۳۴ بخشی بازار الہ آباد سے شائع کیا



CMTH-13-152 URD